رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۴۰

رمضان ۱۳۷۰ھ

جلد ۳۶ عدد ۳

ماهنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۶ | رمضان ۱۳۷۵ھ مطابق مئی ۱۹۵۶ء | عدد ۳

★ ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی کئی اشاعتوں سے اِن صفحات میں مسلسل اس امر کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ نئے دستور میں مملکت پاکستان کے لیے اسلامی نقشۂ تعمیر طے ہوجانے کے بعد اب اصل تعمیر کا کام شروع ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں معاشرے کے مختلف عناصر پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اور ان کے کرنے کے جو کام ہیں وہ تفصیل کے ساتھ بیان کیے جاچکے ہیں۔ اب ہمیں خاص طور پر اُن لوگوں کو خطاب کرنا ہے جو درحقیقت سنجیدگی کے ساتھ چاہتے ہیں کہ یہ کام ہو۔

انہیں سب سے پہلے جو بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں اسلامی نظام کے لیے خواہش کی کوئی کمی نہیں ہے، اصل کمی آمادگی کی ہے، اور اس سے بھی زیادہ کمی استعداد کی۔ اگر آپ صدا لگائیں کہ کون یہاں اسلامی نظام چاہتا ہے تو ایک عنصرِ قلیل کو چھوڑ کر ساری قوم پکار اٹھے گی کہ ہم سب اس کے طالب ہیں۔ لیکن اگر آپ پوچھیں کہ کون اس کے لیے عملاً کچھ کرنے پر آمادہ ہے تو ساری بھیڑ چھٹ جائے گی اور بمشکل سو میں سے پانچ دس آدمی آگے بڑھ کر اس کی حامی بھریں گے۔ پھر اُن آمادگی ظاہر کرنے والوں کا بھی اگر آپ استعداد کے لحاظ سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ بیشتر لوگ اُن کم سے کم بنیادی اوصاف سے بھی خالی ہیں جن کا ہونا اس کام کے لیے ناگزیر ہے۔

دوسری بات جس پر نگاہ رکھے بغیر وہ اپنی ذمہ داری کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے، یہ ہے کہ ہماری قوم کے اندر جتنے بااثر عناصر پائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر بگاڑ کے لیے کام کر رہے ہیں، اور جو بگاڑنے میں لگے ہوئے نہیں ہیں وہ سنوارنے کی فکر سے بھی فارغ ہیں۔ اصلاح و تعمیر کے لیے کوشش کرنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور ان کی قوت کا تناسب بگاڑ کی قوتوں کے مقابلے میں بقدرِ نمک بھی نہیں ہے۔ اس میں جس کسی کو شک ہو وہ ذرا سارے ملک پر

ایک نگاہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ یہاں سیاسی لیڈر، حکومت کے کارفرما اور کارکن، زمیندار، کارخانہ دار، تجار، علماء، اخبار نویس، اور اجتماعی زندگی پر اثر ڈالنے والے دوسرے لوگ زیادہ تر بنانے میں لگے ہوئے ہیں یا بگاڑنے میں۔ اور ہمارے متوسط تعلیم یافتہ طبقے کی عظیم اکثریت کوئی تعمیری فکر و سعی بھی رکھتی ہے یا بس اپنی ذات میں مگن ہے۔

تیسری بات جس سے ان کو غافل نہ رہنا چاہیے یہ ہے کہ موجودہ دور میں اجتماعی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے والی سب سے بڑی طاقت حکومت ہے، اور جس جگہ جمہوری نظام رائج ہو وہاں حکومت کے صحیح یا غلط ہونے کا سارا انحصار اس امر پر ہے کہ عوام الناس صحیح آدمیوں کے ہاتھ میں اقتدار سونپتے ہیں یا غلط آدمیوں کے ہاتھ میں۔ اگر وہ غلط آدمیوں کا انتخاب کر کے ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دیں تو تعلیم، قانون، نشر و اشاعت، نظم و نسق، اور تقسیم رزق کی غلط روش بحیثیت مجموعی پوری قومی زندگی کو بگاڑنے کے لیے اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنی ہمہ گیر طاقت کے ساتھ کام کرے گی کہ منتشر افراد اور اداروں کی اصلاحی کوششیں اس کے مقابلے میں بے بس ہو کر رہ جائیں گی۔ بخلاف اس کے اگر ان کا انتخاب صحیح ہو تو ملک کے تمام ذرائع و وسائل اصلاح کی راہ میں صرف ہونے لگیں گے اور بگاڑ کی طاقتیں عاجز ہو کر رہ جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ بگاڑ کے لیے کام کرنے والے تمام لوگ کسی دوسرے کام پر اتنی طاقت صرف نہیں کرتے جتنی عوام کو بہکانے پر صرف کرتے ہیں، تاکہ وہ کبھی صحیح انتخاب کرنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ وہ اسی میں اپنی موت دیکھتے ہیں۔ ان سب کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جھوٹ اور فریب کے طوفان اٹھا کر، طرح طرح کے مذہبی فتنے کھڑے کر کے، قسم قسم کے جذباتی نعرے لگا کر عام لوگوں کے ذہن کو خوب پراگندہ کر دیں اور پھر دباؤ سے، لالچ سے، اور ہر غیر شریفانہ ہتھکنڈے سے فاسدین و مفسدین کو کامیاب کرائیں۔ یہ بدی کا چکر جب تک چلتا رہے گا اصلاح کی کوئی سعی کارگر نہ ہو سکے گی۔

یہ تین حقیقتیں مل جل کر ایک ایسا بھیانک منظر پیش کرتی ہیں کہ ایک دفعہ تو اسے دیکھ کر

آدمی کا دل بیٹھ جاتا ہے اور وہ مایوسی کے ہجوم میں سوچنے لگتا ہے کہ یہاں کچھ بنائے بن بھی سکے گا یا نہیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں چند حقیقتیں اور بھی ہیں جنھیں نگاہ میں رکھنے سے یاس کے بادل چھٹنے لگتے ہیں، اور امید کی شعاعیں چمکنی شروع ہو جاتی ہیں۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ صرف فاسد عناصر ہی سے بھرا ہوا نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ صالح عناصر بھی موجود ہیں۔ ان کے اندر اصلاح و تعمیر کی صرف خواہش ہی نہیں بلکہ آمادگی و استعداد بھی پائی جاتی ہے، اور اگر اس میں کچھ کمی ہے تو وہ تھوڑی سی توجہ اور سعی سے پیدا کی جاسکتی ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم بحیثیت مجموعی شر پسند نہیں ہے۔ بے علمی اور نادانی کی وجہ سے وہ دھوکا کھا سکتی ہے اور کھاتی رہی ہے، لیکن وہ اس بگاڑ پر راضی نہیں ہے جو دھوکا دینے والوں کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے۔ اگر حکمت کے ساتھ منظم اور پیہم سعی کی جائے تو یہاں کی رائے عام کو اصلاح پسند طاقتوں کا مؤید بنانے میں بالآخر کامیابی ہو کر رہے گی۔ مایوسی صرف اُس صورت میں بجا ہو سکتی تھی جب کہ قوم کا سوادِ اعظم خود اُن خرابیوں کا طالب ہوتا جو معاشرے میں مفسد طاقتوں کے غلبے سے برپا ہو رہی ہیں۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ بگاڑ کے لیے کام کرنے والوں کو سب کچھ میسر ہے مگر دو چیزیں میسر نہیں ہیں۔ ایک سیرت و کردار کی طاقت۔ دوسرے اتحاد و اتفاق۔ جہاں تک ان کی سیرت و کردار کا تعلق ہے، اُس کی حالت شاید دنیا کے تمام مفسد طبقوں سے بدتر ہے۔ اس وجہ سے قوم میں ان کا اخلاقی اثر بالکل ختم ہو چکا ہے۔ بلکہ ان کے خلاف عام نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ اُن کا انحصار اب صرف مادی وسائل اور سازشی جوڑ توڑ پر رہ گیا ہے، اور یہ ہتھیار زیادہ دیر تک نہیں چل سکتے۔ رہی دوسری چیز تو حقیقت میں یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان لوگوں کے دلوں میں نفاق ڈال کر انہیں آپس میں لڑا دیا ہے۔ خیر کی راہ اب تک بھی اسی شگاف سے نکل رہی ہے، اور آئندہ بھی یہ شگاف جتنا وسیع ہوتا جائے گا خیر کا راستہ بھی کشادہ ہوتا چلا جائے گا۔ خدانخواستہ اگر یہ لوگ متحد رہتے تو حلق جدا ہی نہیں سکتی تھی۔

آخری اور سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ اقامتِ دین کا کام اللہ تعالیٰ کا اپنا کام ہے اور اس کے لیے جو لوگ بھی کوشش کریں ان کو اللہ کی تائید حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اخلاص اور صبر کے ساتھ کام کریں اور حکمتِ عملی سے غافل نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کی تعداد خواہ کتنی ہی کم ہو اور ان کے وسائل چاہے کتنے ہی قلیل ہوں، آخرکار اللہ کی تائید سرکسر پوری کر دیتی ہے۔

مایوس کن ظاہر کے پیچھے امید کا یہ سروسامان ہے جو ڈھارس بندھاتا ہے کہ پاکستان کو صحیح معنوں میں دارالاسلام بنانے کے لیے کام کرنا محض ممکن ہی نہیں ہے بلکہ اس کا فائز المرام ہونا بھی متوقع ہے۔ البتہ ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ بھی اس قوم میں اصلاح و تعمیر کی حقیقی خواہش رکھنے والے موجود ہیں وہ آرزوؤں اور تمناؤں کی منزل سے نکل کر کچھ کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور ان طریقوں سے کام کریں جو سنت اللہ کے مطابق کامیابی کے لیے مقرر ہیں۔ سنت اللہ یہ نہیں ہے کہ آپ بس خرابیوں پر بیٹھے تنقید ہی کرتے رہیں اور وہ محض آپ کی باتوں سے دور ہو جائیں۔ سنت اللہ یہ بھی نہیں ہے کہ آپ اسلامی نظام کے لیے صرف دعائیں مانگا کریں اور آسمان سے فرشتے آ کر آپ کے لیے اسے قائم کر دیں۔ جنگل کا ایک کانٹا اور راستے کا ایک روڑا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا جب تک آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں، پھر بھلا معاشرے میں مدتوں کی رچی اور بسی ہوئی خرابیاں محض زبان کے جھاگ اڑانے سے کیسے رفع ہو جائیں گی۔ گیہوں کا ایک دانہ بھی کسان کی عرق ریزی کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، پھر کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ معاشرے اور ریاست میں خیرات و حسنات کی کھیتی بس دعاؤں اور تمناؤں سے لہلہانے لگے گی۔ تنقیدیں کارگر ہوتی ہیں، مگر اس وقت جب کہ ان کی پشت پر کوئی سعی و عمل بھی ہو۔ دعائیں بر آتی ہیں، مگر اس وقت جب کہ عالمِ اسباب میں ہم اپنے کرنے کا کام پورا کر دیں اور پھر اس کے بارآور ہونے کے لیے اللہ سے دعا مانگیں۔ فرشتے بلاشبہ اترتے ہیں مگر خود لڑنے کے لیے نہیں بلکہ اُن اہلِ حق کی مدد کے لیے اترتے ہیں جو خدا کی راہ میں جانیں لڑا رہے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کبھی یہ نہیں کیا کہ براہِ راست اپنی تکوینی مداخلت سے کسی بگڑے ہوئے

انسانی نظام کو خود ٹھیک کر دیا ہو اور کسی فاسد معاشرے کو اپنی طرف سے صالح بنا ڈالا ہو۔ جس معاشرے کے افراد اور گروہ بگاڑ کے کام میں لگے ہوئے ہوں اور بناؤ کی خواہش رکھنے والے بناؤ کے لیے عملاً کچھ نہ کریں، اُس کے لیے اللہ کی سنت یہی ہے کہ وہ اُس کو اُسی انجام کی طرف لے جاتا ہے جس کی طرف وہ خود دوڑ رہا ہے۔ اُس کی نظرِ کرم تو صرف اُس معاشرے کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس کے اندر برائی کے مقابلے میں بھلائی کو قبول کرنے کا رُجحان موجود ہو اور بُرائی پھیلانے والوں کے مقابلے میں بھلائی قائم کرنے کے لیے ایک عنصرِ صالح عملاً کشمکش اور مجاہدہ کر رہا ہو۔ بلکہ اس کے ہاں ہر کشمکش بھی، جو دین کے نام پر محض لکدکوب کی نوعیت رکھتی ہو پھل ہونے کی مستحق نہیں ہوتی وہ منظم ہونی چاہیے، باقاعدہ ہونی چاہیے، صبر و استقلال کے ساتھ ہونی چاہیے، حکمت و دانش اور قواعدِ فطرت کے مطابق ہونی چاہیے، اور سب سے زیادہ یہ کہ نیت کے لحاظ سے خالص اور اخلاق کے لحاظ سے ستھری اور پاکیزہ ہونی چاہیے۔ ایک کمزوری بھی اگر کسی جگہ اس میں رہ جائے تو خدا کا بے لاگ قانون ایسا ہے کہ وہ اُس کا نقصان سامنے لا کر رکھ دیتا ہے حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین رہنمائی میں صحابۂ کرام جیسے صالح ترین لوگوں کی جو جماعت اعلائے کلمۃ الحق کے لیے انتہائی مخلصانہ جدوجہد کر رہی تھی اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اُحد اور حُنین میں بعض کمزوریوں کا نتیجہ دکھانے سے معاف نہیں رکھا۔ اس کے بعد کون یہ امید کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اس کی خاطر سنت اللہ میں بال برابر بھی ترمیم کر دی جائے گی۔

پس جو لوگ بھی عمل کے لیے کوئی آمادگی اپنے اندر رکھتے ہیں انہیں غلط توقعات اور بے جا امیدوں کو چھوڑ کر ٹھنڈے دل سے اس کام اور اس کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے، پھر خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ انہیں یہ کام کرنا ہے یا صرف بگاڑ پر نوحہ خوانی کرنے اور بناؤ کی آرزوئیں دل میں پالنے پر قناعت کرنی ہے۔ عمل کا فیصلہ جسے بھی کرنا ہو جوش میں آکر نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ وقتی جوش میں یہ طاقت تو ضرور ہے کہ آدمی اٹھے اور سینے پر گولی کھا کر جان دے دے

لیکن اس میں یہ طاقت نہیں ہے کہ آدمی کو چار دن بھی کسی ایک برائی سے اجتناب یا ایک بھلائی کے التزام پر قائم رکھ سکے، کجا کہ اس کے بل بوتے پر کوئی شخص عمر بھر ایک مقصد کے پیچھے لگاتار محنت کرتا چلا جائے۔ تعمیری کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا سوچا سمجھا فیصلہ یہ ہو کہ انہیں اپنی عمر عزیز اسی کام میں کھپانی ہے۔

آمادگیٔ عمل کے بعد لوگ بالعموم لائحۂ عمل کے سوال پر آجاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اچھا، ہم نے کام کا فیصلہ کر لیا، اب بتاؤ کہ وہ پروگرام کیا ہے جس پر ہم کام کریں۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ فیصلۂ عمل اور لائحۂ عمل کے درمیان مدارِ کار خود عامل کی ذات ہے جس کو نظر انداز کر کے کام اور پروگرام کی باتیں شروع کر دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ ہر پروگرام کو ہر طرح کے آدمی عمل میں لا سکتے ہیں، اور یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ عمل کے لیے صرف ارادۂ عمل کافی ہے جس کے بعد بس ایک لائحۂ عمل ہی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر ہمارے ہاں بڑے بڑے کام شروع ہوئے اور آخر کار نتیجۂ مطلوب تک پہنچنے میں ناکام ہو کر رہ گئے۔ اصل چیز اسکیم اور پروگرام نہیں بلکہ اس کے چلانے والے لوگ ہیں۔ ان کے اوصاف — ایک ایک فرد کے ذاتی اوصاف بھی اور سب کے اجتماعی اوصاف بھی — وہ اصل طاقت ہیں جو اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ اس اسکیم اور پروگرام کو کامیاب ہونا ہے یا ناکام۔ ان کی ہر کمزوری نتائج پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہر خوبی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ وہ عمدہ اوصاف کے مالک ہوں تو ایک غلط اسکیم اور برے لائحۂ عمل کو بھی ایک دفعہ تو اس طرح چلا کر دکھا دیتے ہیں کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر ان کی صلاحیت ناقص ہو تو بہتر سے بہتر کام بھی بگڑ جاتا ہے، حتیٰ کہ دنیا کو خود اس کام کی صحت میں بھی شک ہو جاتا ہے جسے عمل میں لانے کے لیے نااہل لوگ میسر آئے ہوں۔ لہٰذا ہم کو تعمیر و اصلاح کی عملی تجاویز پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کام کے لیے جو لوگ آگے بڑھیں انہیں کن صلاحیتوں سے آراستہ، کن اوصاف سے متصف، اور کن عیوب سے پاک ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ اس طرح کے آدمیوں کی

تیاری کے ذرائع کیا ہیں۔

آئندہ صحبتوں میں ہم اس مضمون کو حسب ذیل ترتیب کے ساتھ بیان کریں گے:

(۱) وہ اوصاف جو اس مقصد کے لیے کام کرنے والے ہر فرد میں بذات خود ہونے چاہئیں۔

(۲) وہ اوصاف جو ان کے اندر من حیث الجماعت ہونے چاہئیں۔

(۳) وہ اوصاف جو دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ خلق میں کامیاب ہونے کے لیے درکار ہیں۔

(۴) وہ بڑی بڑی برائیاں جن سے ان کو فرداً فرداً اور من حیث الجماعت پاک ہونا چاہیے۔

(۵) وہ تدابیر جن سے مطلوبہ اوصاف کے نشوونما اور نامحمود اوصاف سے افراد اور جماعت کے تزکیے میں مدد لی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ معاشرے کو اسلامی نظام کے لیے تیار کرنے کی عملی تدبیریں کیا ہیں اور ان کو عمل میں لانے کے لیے ان لوگوں کو کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔

مگر اس ترتیب سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اسی ترتیب کے ساتھ ان لوگوں کو پہلے ایک مدت دراز اپنی تعمیرِ ذات میں صرف کرنی ہوگی، پھر کہیں تعمیر معاشرہ کی نوبت آئے گی۔ دراصل یہ دونوں کام ایک ساتھ کرنے کے ہیں، اور جب بھی یہ ہوتے ہیں ایک ہی ساتھ ہوتے ہیں۔ ان کا تقدم و تاخر زمانی نہیں بلکہ اعتباری ہے۔ کام سے پہلے کام کرنے والوں کے اوصاف اور ان کی تیاری کے ذرائع بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ جو بھی اس کام کے لیے آگے بڑھے وہ اس مرقع کو اپنے سامنے رکھ لے۔ یہ سمجھ کر آئے کہ اسے یہ کچھ بننا ہے اور اس تیاری میں اِن ذرائع سے مدد لینی ہے۔ مگر کام اسے اوّل روز ہی سے شروع کر دینا ہوگا اور مردِ کار بننے کی تیاری ساتھ ساتھ کرنی ہوگی۔ کام خود اس تیاری کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کام کے بغیر محض تیاری کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ جس طرح پانی میں اترے بغیر محض خشکی میں ہاتھ پاؤں مارتے رہنے سے کوئی شخص تیراک نہیں بن سکتا اسی طرح میدانِ کار میں اترے بغیر کوئی تیاری بھی آدمی کو مردِ کار نہیں بنا سکتی

تفہیمُ القرآن

الفُرقان

نام | پہلی ہی آیت تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی قرآن کی اکثر سورتوں کے ناموں کی طرح علامت کے طور پر ہے نہ کہ عنوانِ مضمون کے طور پر۔ تاہم مضمونِ سورہ کے ساتھ یہ نام ایک قریبی مناسبت رکھتا ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

زمانۂ نزول | اندازِ بیان اور مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول بھی وہی ہے جو سورۂ مومنون وغیرہ کا ہے، یعنی زمانۂ قیامِ مکہ کا دورِ متوسط۔ ابن جریر اور امام رازی نے ضحاک بن مزاحم اور مقاتل بن سلیمان کی یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ سورۃ سورۂ نساء سے ۸ سال پہلے اتری تھی۔ اس حساب سے بھی اس کا زمانۂ نزول وہی دورِ متوسط قرار پاتا ہے (ابن جریر، جلد ۱۹، صفحہ ۲۸-۳۰۔ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۵۸)

موضوع و مباحث | اس میں ان شبہات و اعتراضات پر کلام کیا گیا ہے جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، اور آپ کی پیش کردہ تعلیم پر کفارِ مکہ کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک ایک کا جچا تلا جواب دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ دعوتِ حق سے منہ موڑنے کے برے نتائج بھی صاف صاف بتائے گئے ہیں۔ آخر میں سورۂ مومنون کی طرح اہلِ ایمان کی اخلاقی خوبیوں کا ایک نقشہ کھینچ کر عوام الناس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ اس کسوٹی پر کس کر دیکھ لو، کون کھوٹا ہے اور کون کھرا۔ ایک طرف اس سیرت و کردار کے لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے اب تک

تیار ہوئے ہیں اور آیندہ تیار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ۔ دوسری طرف وہ نمونہ اخلاق ہے جو عام اہل عرب میں پایا جاتا ہے اور جسے برقرار رکھنے کے لیے جاہلیت کے علمبردار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں ۔ اب خود فیصلہ کرو کہ ان دونوں نمونوں میں سے کسے پسند کرتے ہو؟ یہ ایک غیر ملفوظ سوال تھا جو عرب کے ہر باشندے کے سامنے رکھ دیا گیا، اور چند ہی سال کے اندر ایک چھوٹی سی اقلیت کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس کا جو جواب دیا وہ جریدۂ روزگار پر ثبت ہو چکا ہے ۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

نہایت متبرک ہے[1] وہ جس نے یہ فرقان[2] اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان

---

[1] اصل میں لفظ تَبَارَکَ استعمال ہوا ہے جس کا پورا مفہوم کسی ایک لفظ تو درکنار ایک فقرے میں بھی ادا ہونا مشکل ہے ۔ اس کا مادہ ب ر ک ہے جس سے دو مصدر بَرَکَۃ اور بُرُوک نکلے ہیں ۔ بَرَکَۃ میں افزونی، فراوانی، کثرت اور زیادتی کا تصور ہے اور بُرُوک میں ثبات، بقاء اور لزوم کا تصور ۔ پھر جب اس مصدر سے تَبَارَکَ کا صیغہ بنایا جاتا ہے تو بابِ تفاعل کی خصوصیت، مبالغہ اور اظہارِ کمال، اس میں اور شامل ہو جاتی ہے اور اس کا مفہوم انتہائی فراوانی، بڑھتی اور چڑھتی افزونی اور کمال درجے کی پائیداری ہو جاتا ہے ۔ یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف حیثیتوں سے کسی چیز کی فراوانی کے لیے، یا اس کے ثبات و دوام کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بولا جاتا ہے ۔ مثلاً کبھی اس سے مراد بلندی میں بہت بڑھ جانا ہوتا ہے ۔ جیسے کہتے ہیں تَبَارَکَتِ النَّخْلَۃ، یعنی فلاں کھجور کا درخت بہت اونچا ہو گیا۔ اصمعی کہتا ہے کہ ایک بدو ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا، "تَبَارَکْتُ عَلَیْکُمْ"، میں تم سے اونچا ہو گیا ہوں۔ کبھی اسے عظمت اور بزرگی میں بڑھ جانے کے لیے بولتے ہیں۔ کبھی اس کو فیض رسانی اور خیر اور بھلائی میں بڑھے ہوئے ہونے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی اس سے پاکیزگی و تقدس کا کمال مراد ہوتا ہے ۔ اور یہی کیفیت اس کے معنی ثبوت و لزوم کی بھی ہے ۔

والوں کے لیے نذیر ہو۳ ــ وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۴، جس نے کسی کو

موقع و محل اور سیاق و سباق بتا دیتا ہے کہ کس جگہ اس لفظ کا استعمال کس غرض کے لیے کیا گیا ہے۔ یہاں جو مضمون آگے چل کر بیان ہو رہا ہے اس کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ کے لیے تَبَارَکَ ایک معنی میں نہیں، بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

(۱) بڑا محسن اور نہایت باخیر۔ اس لیے کہ اس نے اپنے بندے کو فرقان کی عظیم الشان نعمت سے نواز کر دنیا بھر کو خبردار کرنے کا انتظام فرمایا۔

(۲) نہایت بزرگ و باعظمت، اس لیے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اُسی کی ہے۔

(۳) نہایت مقدس و منزّہ، اس لیے کہ اُس کی ذات ہر شائبۂ شرک سے پاک ہے۔ نہ اس کا کوئی ہم جنس، کہ ذاتِ خداوندی میں اس کا نظیر و مثیل ہو، اور نہ اس کے لیے فنا و تغیر کہ اسے جانشینی کے لیے بیٹے کی حاجت ہو۔

(۴) نہایت بلند و برتر، اس لیے کہ بادشاہی ساری کی ساری اسی کی ہے اور کسی دوسرے کا یہ مرتبہ نہیں کہ اس کے اختیارات میں اس کا شریک ہو سکے۔

(۵) کمالِ قدرت کے اعتبار سے برتر، اس لیے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کو پیدا کرنے والا اور ہر شے کی تقدیر مقرر کرنے والا ہے۔

۲ھ یعنی قرآن مجید۔ فُرقان مصدر ہے مادّہ ف ر ق سے، جس کے معنی ہیں دو چیزوں کو الگ کرنا، یا ایک ہی چیز کے اجزاء کا الگ الگ ہونا۔ قرآن مجید کے لیے اس لفظ کا استعمال یا تو فارِق کے معنی میں ہوا ہے، یا مفروق کے معنی میں، یا پھر اس سے مقصود مبالغہ ہے، یعنی فرق کرنے کے معاملے میں اس کا کمال اتنا بڑھا ہوا ہے کہ گویا وہ خود ہی فرق ہے۔ اگر پہلے اور تیسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ کسوٹی اور فیصلہ کن چیز اور معیارِ فیصلہ (CRITERION) کے ہوں گے۔ اور اگر دوسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب الگ الگ اجزاء پر مشتمل چیز کے ہوں گے۔ قرآن مجید کو ان دونوں ہی اعتبارات سے "الفرقان" کہا گیا ہے۔

۳ھ اصل میں لفظ نَزَّلَ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں بتدریج، تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا۔ اس تمہیدی مضمون کی

بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے

مناسبت آگے چل کر آیت ۳۲ (رکوع ۳) کے مطالعہ سے معلوم ہوگی جہاں کفارِ مکہ کے اس اعتراض پر گفتگو کی گئی ہے کہ "یہ قرآن پورا کا پورا ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟"

۵۴ یعنی خبردار کرنے والا، متنبہ کرنے والا، غفلت اور گمراہی کے برے نتائج سے ڈرانے والا۔ اس سے مراد "فرقان" بھی ہو سکتا ہے، اور وہ "بندہ" بھی جس پر فرقان نازل کیا گیا۔ الفاظ ایسے جامع ہیں کہ دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں، اور حقیقت کے اعتبار سے چونکہ دونوں ایک ہیں، اور ایک ہی کام کے لیے بھیجے گئے ہیں، اس لیے کہنا چاہیے کہ دونوں ہی مراد ہیں۔ پھر یہ جو فرمایا کہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو، تو اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی دعوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کسی ایک ملک کے لیے نہیں، پوری دنیا کے لیے ہے، اور اپنے ہی زمانے کے لیے نہیں، آنے والے تمام زمانوں کے لیے ہے۔ یہ مضمون متعدد مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً فرمایا یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا "اے انسانو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں" (الاعراف۔ رکوع ۲۰) وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ "میری طرف یہ قرآن بھیجا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تم کو خبردار کروں اور جس جس کو بھی یہ پہنچے" (الانعام۔ ۲) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا "ہم نے تم کو سارے ہی انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے" (سبا۔ ۳)۔ اور اسی مضمون کو خوب کھول کھول کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بار بار بیان فرمایا ہے کہ بعثت الی الاحمر والاسود "میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں"۔ اور کان النبی یبعث الی قومه خاصة وبعثت الی الناس عامة "پہلے ایک نبی خاص طور پر اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، اور میں عام طور پر تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں" (بخاری و مسلم)، اور وارسلت الی الخلق کافة وختم بی النبیون "میں ساری خلقت کی طرف بھیجا گیا ہوں اور ختم کر دیے گئے میری آمد پر انبیاء" (مسلم)

۵۵ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے لیے ہے"، یعنی وہی اس کا حق دار ہے اور اسی کے لیے وہ مخصوص ہے، کسی دوسرے کو نہ اس کا حق پہنچتا ہے اور نہ کسی دوسرے کا اس میں کوئی حصہ ہے۔

۵۶ یعنی نہ تو کسی سے اس کا کوئی نسبی تعلق ہے، اور نہ کسی کو اس نے اپنا متبنّٰی بنایا ہے۔ کوئی ہستی کا ... ہے

ایسی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے نسلی تعلق یا تبنیت کے تعلق کی بنا پر اس کو معبودیت کا استحقاق پہنچتا ہو۔ اُس کی ذات یکتائے شخص ہے، کوئی اس کا ہم جنس نہیں، اور کوئی خدائی خاندان نہیں کہ معاذ اللہ، ایک خدا سے کوئی نسل چلی ہو اور بہت سے خدا پیدا ہوتے چلے گئے ہوں۔ اس بنا پر وہ تمام مشرکین صریح جاہل و گمراہ ہیں جنھوں نے فرشتوں، یا جنوں، یا بعض انسانوں کو خدا کی اولاد سمجھا اور اس بنا پر انھیں دیوتا اور معبود قرار دے لیا۔ اسی طرح وہ لوگ بھی نری جہالت و گمراہی میں مبتلا ہیں جنھوں نے نسلی تعلق کی بنا پر نہ سہی، کسی خصوصیت کی بنا پر ہی سہی، اپنی جگہ یہ سمجھ لیا کہ خداوند عالم نے کسی شخص کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ "بیٹا بنا لینے" کے اس تصور کو جس پہلو سے بھی دیکھا جائے، یہ سخت غیر معقول نظر آتا ہے، کجا کہ یہ ایک امر واقعی ہو۔ جن لوگوں نے یہ تصور ایجاد یا اختیار کیا ان کے گھٹیا ذہن ذات الٰہی کی برتری کا تصور کرنے سے عاجز تھے۔ انھوں نے اُس ذات بے ہمتا و بے نیاز کو انسانوں پر قیاس کیا، جو یا تو تنہائی سے گھبرا کر کسی دوسرے کے بچے کو گود لے لیتے ہیں، یا جذباتِ محبت کے وفور سے کسی کو بیٹا بنا لیتے ہیں، یا متبنّیٰ بنانے کی اس لیے ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی تو اُن کا وارث اور اُن کے نام اور کام کو زندہ رکھنے والا ہو۔ یہی تین وجوہ ہیں جن کی بنا پر انسانی ذہن میں تبنیت کا خیال پیدا ہوا ہے، اور ان میں سے جس وجہ کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے، سخت جہالت اور گستاخی اور کم عقلی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۲۹۸ - ۲۹۹)

؎ اصل میں لفظ مُلک استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں بادشاہی، اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت (SOVEREIGNTY) کے لیے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا مختارِ مطلق ہے اور فرمانروائی کے اختیارات میں ذرہ برابر بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ چیز آپ سے آپ اس بات کو مستلزم ہے کہ پھر معبود بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان جس کو بھی معبود بناتا ہے یہ سمجھ کر بناتا ہے کہ اس کے پاس کوئی طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے اور ہماری قسمتوں پر اچھا یا برا اثر ڈال سکتا ہے۔ بے زور اور بے اثر ہستیوں کو ملجا و ماویٰ بنانے کے لیے کوئی احمق سے احمق انسان بھی کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا اس کائنات میں کسی کے

ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔ لوگوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے

پاس بھی کوئی زور نہیں رہے، تو پھر نہ کوئی گردن اس کے سوا کسی کے آگے اظہار عجز و نیاز کے لیے جھکے گی، نہ کوئی ہاتھ اس کے سوا کسی کے آگے نذر پیش کرنے کے لیے بڑھے گا، نہ کوئی زبان اس کے سوا کسی کی حمد کے ترانے گائے گی یا دعا و التجا کے لیے کھلے گی، اور نہ دنیا کے کسی نادان سے نادان آدمی سے بھی کبھی یہ حماقت سرزد ہو سکے گی کہ وہ اپنے حقیقی خدا کے سوا کسی اور کی طاعت و بندگی بجا لائے، یا کسی کو بذاتِ خود حکم چلانے کا حق دار مانے۔ اس مضمون کو مزید تقویت اوپر کے اس فقرے سے پہنچتی ہے کہ "آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اس کی ہے اور اس کے سب ہے"

شہ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ہر چیز کو ایک اندازۂ خاص پر رکھا"، یا "ہر چیز کے لیے ٹھیک ٹھیک پیمانہ مقرر کیا"۔ لیکن خواہ کوئی ترجمہ بھی کیا جائے، بہرحال اس سے پورا مطلب ادا نہیں ہوتا۔ پورا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ کائنات کی ہر چیز کو وجود بخشا ہے، بلکہ وہی ہے جس نے ایک ایک چیز کے لیے صورت، جسامت، قوت و استعداد، اوصاف و خصائص، کام اور کام کا طریق، بقا کی مدت، عروج و ارتقا کی حد، اور دوسری وہ تمام چیزیں مقرر کی ہیں جو اس کی ذات سے متعلق ہیں، اور پھر اسی نے عالم وجود میں وہ اسباب و وسائل اور مواقع پیدا کیے ہیں جن کی بدولت ہر چیز یہاں اپنے اپنے دائرے میں اپنے حصے کا کام کر رہی ہے۔

اس ایک آیت میں توحید کی پوری تعلیم سمیٹ دی گئی ہے۔ قرآن مجید کی جامع آیات میں سے یہ ایک عظیم الشان آیت ہے جس کے چند الفاظ میں اتنا بڑا مضمون سمو دیا گیا ہے کہ ایک پوری کتاب بھی اس کی وسعتوں کا احاطہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ حدیث میں آتا ہے کہ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا افصح الغلام من بنی عبد المطلب علمہ ھٰذہ الآیۃ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قاعدہ تھا کہ حضور کے خاندان میں جب کسی بچے کی زبان کھل جاتی تھی تو آپ یہ آیت اسے سکھاتے تھے" (مصنف عبد الرزاق و مصنف ابن ابی شیبہ، بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ)۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے ذہن میں توحید کا پورا تصور بٹھانے کے لیے یہ آیت ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس کے بچے جب ہوش سنبھالنے لگیں تو آغاز ہی میں ان کے ذہن پر یہ نقش ثبت کر دے۔

جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں[۹]، جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ مار سکتے ہیں نہ جِلا سکتے ہیں نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں[۱۰]۔

جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اِس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم[۱۱] اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اُتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں، یہ پُرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔ اے محمدؐ، ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اُس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے[۱۲]۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا

---

۹ جامع الفاظ ہیں جو ہر قسم کے جعلی معبودوں پر حاوی ہیں۔ وہ بھی جن کو خدا نے پیدا کیا اور انسان ان کو معبود بنا بیٹھا، مثلاً فرشتے، جن، انبیاء، اولیاء، سورج، چاند، سیارے، درخت، دریا، جانور وغیرہ۔ اور وہ بھی جن کو انسان خود بناتا ہے اور خود ہی معبود بنا لیتا ہے، مثلاً پتھر اور لکڑی کے بُت۔

۱۰ حاصلِ کلام یہ ہوا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے ایک بندے پر فُرقان اس لیے نازل کیا کہ حقیقت تو تھی وہ اور لوگ اُس سے غافل ہو کر پڑ گئے اس گمراہی میں، لہٰذا ایک بندہ نذیر بنا کر اٹھایا گیا ہے، تاکہ لوگوں کو اس حماقت کے بُرے نتائج سے خبردار کرے، اور اس پر بتدریج یہ فرقان نازل کرنا شروع کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ حق کو باطل سے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کر کے دکھا دے۔

۱۱ دوسرا ترجمہ "بڑی بے انصافی کی بات" بھی ہو سکتا ہے۔

۱۲ یہ وہی اعتراض ہے جو اِس زمانے کے مستشرقینِ مغرب قرآن مجید کے خلاف پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں بُحیرا راہب سے جب ملے تھے اُس وقت یہ سارے مضامین تم نے سیکھ لیے تھے۔ اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تجارتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے اُس زمانے میں تم نے عیسائی راہبوں اور یہودی ربیوں سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ اس لیے کہ ان سارے سفروں کا حال اُن کو معلوم تھا۔ یہ سفر اکیلے نہیں ہوئے تھے، اُن کے اپنے قافلوں کے ساتھ ہوئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں

کچھ سیکھ آنے کا الزام ہم لگائیں گے تو ہمارے اپنے ہی شہر میں سینکڑوں زبانیں ہم کو جھٹلا دیں گی۔ اس کے علاوہ مکے کا ہر عام آدمی پوچھے گا کہ اگر یہ معلومات اس شخص کو بارہ تیرہ برس کی عمر میں بحیرا سے حاصل ہو گئی تھیں، یا ۲۵ برس کی عمر سے، جب کہ اس نے تجارتی سفر شروع کیے تھے، حاصل ہونی شروع ہوئی تھیں، تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا تھا، ہمارے ہی درمیان رہتا بستا تھا، کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک اس کا یہ سارا علم چھپا رہا اور کبھی ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ایسا نہ نکلا جو اس علم کی غمازی کرتا؟ یہی وجہ ہے کہ کفارِ مکہ نے اتنے سفید جھوٹ کی جرأت نہ کی اور اُسے بعد کے زیادہ بے حیا لوگوں لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ جو بات کہتے تھے وہ نبوت سے پہلے کے متعلق نہیں بلکہ دعوائے نبوت کے زمانے کے متعلق تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص اَن پڑھ ہے۔ خود مطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا۔ پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا۔ چالیس برس کی عمر تک ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ جانتا تھا جو آج اس کی زبان سے نکل رہی ہیں۔ اب آخر یہ معلومات آ کہاں سے رہی ہیں؟ ان کا سرچشمہ لامحالہ کچھ اگلے لوگوں کی کتابیں ہیں جن کے اقتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں، انہیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے، اور پھر انہیں یاد کر کے ہمیں دن کو سناتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہلِ کتاب تھے، پڑھے لکھے تھے، اور مکہ میں رہتے تھے، یعنی عدّاس (حُوَیطب بن عبدالعُزّیٰ کا آزاد کردہ غلام)، یَسار (علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام)، اور جَبر (عامر بن ربیعہ کا آزاد کردہ غلام)

بظاہر بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وحی کے دعوے کو رد کرنے کے لیے نبی کے مأخذِ علم کی نشان دہی کر دینے سے بڑھ کر اور کونسا اعتراض وزنی ہو سکتا ہے۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ جواب میں سرے سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی، بلکہ صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو، صریح بے انصافی کی بات کہہ رہے ہو، سخت جھوٹ کا طوفان اٹھا رہے ہو، یہ تو اُس خدا کا کلام ہے جو آسمان و زمین کا بھید جانتا ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ سخت مخالفت کے ماحول میں ایسا زوردار اعتراض پیش کیا جائے اور اس کو یوں حقارت سے رد کر دیا جائے؟ کیا واقعی یہ ایسا ہی

پوچ اور بے وزن اعتراض تھا کہ اس کے جواب میں بس "جھوٹ اور ظلم" کہہ دینا کافی تھا؟ آخر وجہ کیا ہے کہ اس مختصر سے جواب کے بعد نہ عوام نے کسی تفصیلی اور واضح جواب کا مطالبہ کیا، نہ نئے نئے ایمان لانے والوں کے دلوں میں کوئی شک پیدا ہوا، اور نہ مخالفین ہی میں سے کسی کو یہ کہنے کی ہمت ہوئی کہ دیکھو، ہمارے اس وزنی اعتراض کا جواب بن نہیں پڑ رہا ہے اور محض جھوٹ اور ظلم کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے؟

اس گتھی کا حل ہمیں اسی ماحول سے مل جاتا ہے جس میں مخالفین اسلام نے یہ اعتراض کیا تھا:

پہلی بات یہ تھی کہ مکے کے وہ ظالم سردار جو ایک ایک مسلمان کو مارتے کوٹتے اور تنگ کرتے پھر رہے تھے، ان کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن جن لوگوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ پرانی پرانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے محمدؐ کو یاد کرایا کرتے ہیں، ان کے گھروں پر اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر چھاپے مارتے اور وہ سارا ذخیرہ برآمد کر کے پبلک کے سامنے لا رکھتے جو ان کے زعم میں اس کام کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ وہ ہمیں اس وقت چھاپا مار سکتے تھے جب کہ یہ کام کیا جا رہا ہو اور ایک مجمع کو دکھا سکتے تھے کہ لو دیکھو، یہ نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بلالؓ کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹنے والوں کے لیے ایسا کرنے میں کوئی آئینی ضابطہ مانع نہ تھا، اور ایسا کر کے وہ ہمیشہ کے لیے نبوت محمدی کے خطرے کو مٹا سکتے تھے۔ مگر وہ بس زبانی اعتراض ہی کرتے رہے اور ایک دن بھی یہ فیصلہ کن قدم اٹھا کر انھوں نے نہ دکھایا۔

دوسری بات یہ تھی کہ جن لوگوں کے وہ اس سلسلے میں نام لیتے تھے وہ کہیں باہر کے نہ تھے، اسی شہر مکہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی قابلیتیں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ ہر شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا تھا، یہ دیکھ سکتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز پیش کر رہے ہیں، وہ کس پائے کی ہے، کس شان کی زبان ہے، کس مرتبے کا ادب ہے، کیا زور کلام ہے، کیسے بلند خیالات اور مضامین ہیں، اور وہ کس درجے کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمدؐ ان سے یہ سب کچھ حاصل کر کر کے لا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی نے بھی اس اعتراض کو کوئی وزن نہ دیا۔ ہر شخص سمجھتا تھا کہ ان باتوں سے بس دل کے جلے پھپھولے پھوڑے جا رہے ہیں، ورنہ اس قول میں کسی شبہ کے قابل بھی جان نہیں ہے۔ جو لوگ ان اشخاص سے واقف نہ تھے وہ بھی آخر اتنی ذرا سی

بات تو سوچ سکتے تھے کہ اگر یہ لوگ ایسی ہی قابلیت رکھتے تھے تو آخر انھوں نے خود اپنا چراغ کیوں نہ جلایا؟ ایک دوسرے شخص کے چراغ کو تیل مہیا کرنے کی انہیں ضرورت کیا پڑی تھی؟ اور وہ بھی چپکے چپکے کہ اس کام کی شہرت کا ذرا سا حصہ بھی ان کو نہ ملے؟

تیسری بات یہ تھی کہ وہ سب اشخاص جن کا اس سلسلے میں نام لیا جارہا تھا، بیرونی ممالک سے آئے ہوئے غلام تھے جن کو ان کے مالکوں نے آزاد کر دیا تھا۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کوئی شخص بھی کسی طاقت ور قبیلے کی حمایت کے بغیر نہ جی سکتا تھا۔ آزاد ہو جانے پر بھی غلام اپنے سابق مالکوں کے ولاء (سرپرستی) میں رہتے تھے اور ان کی حمایت ہی معاشرے میں ان کے لیے زندگی کا سہارا ہوتی تھی۔ اب یہ ظاہر بات تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی بدولت، معاذ اللہ، ایک جھوٹی نبوت کی دکان چلا رہے تھے تو یہ لوگ کسی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ تو اس سازش میں آپ کے شریک نہ ہو سکتے تھے۔ آخر ایسے شخص کے مخلص رفیق کار اور سچے عقیدت مند کیسے ہو سکتے تھے جو رات کو انہی سے کچھ باتیں سیکھتا ہو اور دن کو دنیا بھر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا ہو کہ یہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اس لیے ان کی شرکت کسی لالچ اور کسی غرض ہی کی بنا پر ہو سکتی تھی۔ مگر کون صاحبِ عقل و ہوش آدمی یہ باور کر سکتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے سرپرستوں کو ناراض کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سازش میں شریک ہو گئے ہوں گے؟ آخر کیا لالچ ہو سکتا تھا جس کی بنا پر وہ ساری قوم کے مغضوب و مطعون اور ساری قوم کی دشمنی کے ہدف آدمی کے ساتھ مل جاتے اور اپنے سرپرستوں سے کٹ جانے کے نقصان کو ایسے مصیبت زدہ آدمی سے حاصل ہونے والے کسی فائدے کی امید پر گوارا کر لیتے؟ پھر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ ان کے سرپرستوں کو یہ موقع تو آخر حاصل ہی تھا کہ مار کوٹ کر ان سے سازش کا اقبال کرا لیں۔ اس موقع سے انھوں نے کیوں نہ فائدہ اٹھایا اور کیوں نہ ساری قوم کے سامنے خود انہی سے یہ اعتراف کروا لیا کہ ہم سے سیکھ سیکھ کر یہ نبوت کی دکان چمکائی جارہی ہے؟

سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور اس ضرب المثل عقیدت میں شامل ہوئے جو صحابۂ کرام آنحضور کی ذاتِ مقدس سے رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بناوٹی اور سازشی نبوت پر خود وہی لوگ ایمان لائیں اور گہری عقیدت کے ساتھ ایمان لائیں جنھوں نے اس کے بنانے کی

غفور رحیم ہے۔[13]

کہتے ہیں "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے[14]۔ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟[15] یا اور کچھ نہیں تو اس کے

سازش میں خود حصہ لیا ہو؟ اور بالفرض اگر یہ ممکن بھی تھا تو ان لوگوں کو اہل ایمان کی جماعت میں کوئی نمایاں مرتبہ تو ملا ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نبوت کا کاروبار تو چلے عداس اور یسار اور جبر کے بل بوتے پر، اور نبی کے دست راست بنیں ابوبکر اور عمر اور ابوعبیدہ؟

یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر سننے والے کی نگاہ میں یہ اعتراض آپ ہی بے وزن تھا۔ اس لیے قرآن میں اس کو کسی وزنی اعتراض کی حیثیت سے، جواب دینے کی خاطر نقل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بتانے کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو، حق کی دشمنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے ہیں، اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پر اتر آئے ہیں۔

۱۳؎ اس جگہ یہ فقرہ بڑا معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا شان ہے خدا کی رحیمی و غفاری کی، جو لوگ حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایسے ایسے جھوٹ کے طوفان اٹھاتے ہیں ان کو بھی وہ مہلت دیتا ہے اور سنتے ہی عذاب کا کوڑا نہیں برسا دیتا۔ اس تنبیہ کے ساتھ اس میں ایک پہلو تلقین کا بھی ہے کہ ظالمو، اب بھی اگر اپنے عناد سے باز آجاؤ اور حق بات کو سیدھی طرح مان لو تو جو کچھ آج تک کرتے رہے ہو وہ سب معاف ہو سکتا ہے۔

۱۴؎ یعنی اول تو انسان کا رسول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہو۔ تاہم اگر آدمی ہی رسول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا، نہ یہ کہ ایک ایسا عامی آدمی خداوند عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہو۔ بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اس کے اندر کوئی غیر معمولی پن نہ پاتا ہو۔ بالفاظ دیگر، ان کی رائے میں رسول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ عجوبے دکھانے یا ٹھاٹھ باٹ سے دھونس جمانے کے لیے تھی۔

۱۵؎ یعنی اگر آدمی ہی کو نبی بنایا گیا تھا تو ایک فرشتہ اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور

لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی
حاصل کرتا؟[15] اور ظالم کہتے ہیں "تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی[16] کے پیچھے لگ گئے ہو"۔ دیکھو کیسی کیسی
ع عجیب حجتیں یہ لوگ تمہارے آگے پیش کر رہے ہیں، ایسے بہکے ہیں کہ کوئی ٹھکانے کی بات ان کو نہیں سوجھتی۔[17]

لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات، ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوت کا جلیل القدر منصب عطا کر کے بس یونہی اکیلا چھوڑ دے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور پتھر کھاتا پھرے۔

[15] یہ گویا بدرجۂ آخر ان کا مطالبہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسول ہمارے معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔ نہ خرچ کے لیے مال میسر، نہ پھل کھانے کو کوئی باغ نصیب، اور دعویٰ یہ کہ ہم اللہ رب العالمین کے پیغمبر ہیں۔

[16] یعنی دیوانہ۔ اہل عرب کے نزدیک دیوانگی کے دو ہی وجوہ تھے۔ یا تو کسی پر جن کا سایہ ہو گیا ہو۔ یا کسی دشمن نے جادو کر کے پاگل بنا دیا ہو۔ ایک تیسری وجہ ان کے نزدیک اور بھی تھی، اور وہ یہ کہ کسی دیوی، یا دیوتا کی شان میں آدمی کوئی گستاخی کر بیٹھا ہو اور اس کی مار پڑ گئی ہو۔ کفار مکہ وقتاً فوقتاً یہ تینوں وجوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرتے تھے۔ کبھی کہتے اس شخص پر کسی جن کا تسلط ہو گیا ہے۔ کبھی کہتے کسی دشمن نے بیچارے پر جادو کر دیا ہے۔ اور کبھی کہتے کہ ہمارے دیوتاؤں میں سے کسی کی بے ادبی کرنے کا خمیازہ ہے جو غریب بھگت رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اتنا ہوشیار بھی مانتے تھے کہ ایک دارالترجمہ اس شخص نے قائم کر رکھا ہے اور پرانی پرانی کتابوں کے اقتباسات نکلوا نکلوا کر یاد کرتا ہے۔ مزید براں وہ آپ کو ساحر اور کاہن بھی کہتے تھے۔ گویا آپ ان کے نزدیک مسحور بھی تھے اور ساحر بھی۔ اس پر ایک اور رنگ شاعر ہونے کی تہمت کا بھی تھا۔

[17] یہ اعتراضات بھی جواب دینے کے لیے نہیں بلکہ یہ بتانے کے لیے نقل کیے جا رہے ہیں کہ معترضین کس قدر عناد اور تعصب میں اندھے ہو چکے ہیں۔ ان کی جو باتیں اوپر نقل کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی اس لائق نہیں ہے کہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی جائے۔ ان کا بس ذکر کر دینا ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ

بڑا بابرکت ہے[۱۹] وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے، (ایک نہیں، بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور بڑے بڑے محل۔

مخالفین کا دامن معقول دلائل سے کس قدر خالی ہے اور وہ کیسی لچر اور پوچ باتوں سے ایک مدلل اصولی دعوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے لوگو، یہ شرک جس پر تمہارے مذہب و تمدن کی بنیاد قائم ہے، ایک غلط عقیدہ ہے اور اس کے غلط ہونے کے یہ اور یہ دلائل ہیں۔ جواب میں شرک کے برحق ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی، بس آوازہ کس دیا جاتا ہے کہ یہ جادو کا مارا ہوا آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے کائنات کا سارا نظام توحید پر چل رہا ہے اور یہ یہ حقائق ہیں جو اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جواب میں شور بلند ہوتا ہے جادوگر ہے۔ وہ کہتا ہے تم دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیے گئے ہو، تمہیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے، دوسری زندگی میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس حقیقت پر یہ اخلاقی اور یہ تاریخی اور یہ علمی و عقلی امور دلالت کر رہے ہیں۔ جواب میں کہا جاتا ہے شاعر ہے۔ وہ کہتا ہے میں خدا کی طرف سے تمہارے لیے تعلیم حق لے کر آیا ہوں اور یہ ہے وہ تعلیم۔ جواب میں اس تعلیم پر کوئی بحث و تنقید نہیں ہوتی، بس بلا ثبوت ایک الزام چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کہیں سے نقل کر لیا گیا ہے۔ وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں خدا کے معجزانہ کلام کو پیش کرتا ہے، خود اپنی زندگی اور اپنی سیرت و کردار کو پیش کرتا ہے، اور اس اخلاقی انقلاب کو پیش کرتا ہے جو اس کے اثر سے اس کے پیرؤوں کی زندگی میں ہو رہا تھا۔ مگر مخالفت کرنے والے ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے۔ پوچھتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ تم کھاتے کیوں ہو؟ بازاروں میں کیوں چلتے پھرتے ہو؟ تمہاری اردلی میں کوئی فرشتہ کیوں نہیں ہے؟ تمہارے پاس کوئی خزانہ یا باغ کیوں نہیں ہے؟ یہ باتیں خود ہی بتا رہی تھیں کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور کون اس کے مقابلے میں عاجز ہو کر الٹی سیدھی ہانک رہا ہے۔

[۱۹] - یہاں پھر وہی تبارک کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعد کا مضمون بتا رہا ہے کہ اس جگہ اس کے معنی ہیں "بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے" "غیر محدود قدرت رکھنے والا ہے" "اس سے بالاتر ہے کہ کسی کے حق میں کوئی بھلائی کرنا چاہے اور نہ کر سکے"۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ "اُس گھڑی"[۲۰] کو جھٹلا چکے ہیں[۲۱] — اور جو اُس گھڑی کو جھٹلائے اُس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ وہ جب دُور سے ان کو

۲۰ـ اصل میں لفظ اَلسَّاعَۃ استعمال ہوا ہے۔ ساعت کے معنی گھڑی اور وقت کے ہیں اور ال اس پر عہد کا ہے، یعنی وہ مخصوص گھڑی جو آنے والی ہے، جس کے متعلق ہم پہلے تم کو خبر دے چکے ہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ لفظ ایک اصطلاح کے طور پر اُس وقتِ خاص کے لیے بولا گیا ہے جب کہ قیامت قائم ہوگی، تمام اولین و آخرین از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، سب کو اکٹھا کر کے اللہ تعالیٰ حساب لے گا، اور ہر ایک کو اس کے عقیدہ و عمل کے لحاظ سے جزا یا سزا دے گا۔

۲۱ـ یعنی جو باتیں یہ کر رہے ہیں ان کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو واقعی کسی قابلِ لحاظ بنیاد پر قرآن کے جعلی کلام ہونے کا شبہ ہے، یا ان کو درحقیقت یہ گمان ہے کہ جن آزاد کردہ غلاموں کے یہ نام لیتے ہیں وہ تم کو سکھاتے پڑھاتے ہیں، یا انہیں تمہاری رسالت پر ایمان لانے سے بس اس چیز نے روک رکھا ہے کہ تم کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہو، یا وہ تمہاری تعلیمِ حق کو مان لینے کے لیے تیار تھے مگر صرف اس لیے رُک گئے کہ نہ کوئی فرشتہ تمہاری اردلی میں تھا اور نہ تمہارے لیے کوئی خزانہ اتارا گیا تھا۔ اصل وجہ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے بلکہ آخرت کا انکار ہے جس نے ان کو حق اور باطل کے معاملے میں بالکل غیر سنجیدہ بنا دیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سرے سے کسی غور و فکر اور تحقیق و جستجو کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے اور تمہاری معقول دعوت کو رد کرنے کے لیے ایسی ایسی مضحکہ انگیز حجتیں پیش کرنے لگتے ہیں۔ ان کے ذہن اس تخیل سے خالی ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں اُنہیں خدا کے سامنے جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس چار دن کی زندگی کے بعد مر کر سب کو مٹی ہو جانا ہے۔ بت پرست بھی مٹی ہو جائے گا اور خدا پرست بھی اور منکرِ خدا بھی۔ نتیجہ کسی چیز کا بھی کچھ نہیں نکلنا ہے۔ پھر کیا فرق پڑ جاتا ہے مشرک ہو کر مرنے اور موحد یا ملحد ہو کر مرنے میں۔ صحیح اور غلط کے امتیاز کی اگر ان کے نزدیک کوئی ضرورت ہے تو بس دنیا کی کامیابی و ناکامی کے لحاظ سے ہے۔ اور یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کسی عقیدے یا اخلاقی اصول کا بھی کوئی متعین نتیجہ نہیں ہے جو پوری یکسانی کے ساتھ ہر شخص اور ہر گروہ کے

دیکھے گی[۲۲] تو یہ اُس کے غضب اور جوش کی آوازیں سن لیں گے۔ اور جب یہ دست و پا بستہ اس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے۔ (اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو۔

ان سے پوچھو، یہ انجام اچھا ہے یا وہ اَبدی جنت جس کا وعدہ خدا ترس پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے؟ جو اُن کے عمل کی جزا اور اُن کے سفر کی آخری منزل ہوگی۔ جس میں ان کی ہر خواہش پوری ہوگی، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، جس کا عطا کرنا تمہارے رب کے ذمے ایک واجب الادا وعدہ ہے۔[۲۳]

معاملے میں نکلتا ہو۔ دہریے، آتش پرست، عیسائی، موسائی، ستارہ پرست، بت پرست، سب اچھے اور برے دونوں ہی طرح کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ کوئی ایک عقیدہ نہیں جس کے متعلق تجربہ بتاتا ہو کہ اسے اختیار کرنے والا، یا رد کر دینے والا اس دنیا میں لازماً خوشحال یا لازماً بدحال رہتا ہو۔ بدکار اور نیکوکار بھی یہاں ہمیشہ اپنے اعمال کا ایک ہی مقرر نتیجہ نہیں دیکھتے۔ ایک بدکار مزے کر رہا ہے اور دوسرا سزا پا رہا ہے۔ ایک نیکوکار مصیبت جھیل رہا ہے تو دوسرا معزز و محترم بنا ہوا ہے۔ لہٰذا دنیوی نتائج کے اعتبار سے کسی مخصوص اخلاقی رویے کے متعلق بھی منکرین آخرت اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتے کہ وہ خیر ہے یا شر ہے۔ اس صورت حال میں جب کوئی شخص ان کو ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کی طرف دعوت دیتا ہے تو خواہ وہ کیسے ہی سنجیدہ اور معقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوت پیش کرے، ایک منکرِ آخرت کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کرے گا بلکہ طفلانہ اعتراضات کر کے اسے ٹال دے گا۔

۲۲ھ آگ کا کسی کو دیکھنا ممکن ہے کہ استعارے کے طور پر ہو، جیسے ہم کہتے ہیں وہ جامع مسجد کے مینار تم کو دیکھ رہے ہیں، اور ممکن ہے حقیقی معنوں میں ہو۔ یعنی جہنم کی آگ دنیا کی آگ کی طرح بے شعور نہ ہو بلکہ دیکھ بھال کر جلانے والی ہو۔

۲۳ھ اصل الفاظ ہیں، وعدًا مسئولا، یعنی ایسا وعدہ جس کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

اور وہ دن ہوگا جب کہ (تمہارا رب) ان لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے
اُن معبودوں کو بھی بلا لے گا جنہیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پوج رہے ہیں، پھر وہ اُن سے

یہاں ایک شخص یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ جنت کا یہ وعدہ اور دوزخ کا یہ ڈراوا کسی ایسے شخص پر کیا اثر انداز ہو سکتا ہے جو قیامت اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا پہلے ہی منکر ہو؟ اس لحاظ سے تو بہ ظاہر ایک بے محل کلام محسوس ہوتا ہے، لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے اگر معاملہ یہ ہو کہ میں ایک بات منوانا چاہتا ہوں اور دوسرا نہیں ماننا چاہتا، تو بحث و حجت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔ لیکن اگر میں اپنے مخاطب سے اس انداز میں گفتگو کر رہا ہوں کہ زیر بحث مسئلہ میری بات ماننے یا نہ ماننے کا نہیں بلکہ تمہارے اپنے مفاد کا ہے، تو مخاطب چاہے کیسا ہی ہٹ دھرم ہو، ایک دفعہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں کلام کا طرز یہی دوسرا ہے۔ اس صورت میں مخاطب کو خود اپنی بھلائی کے نقطۂ نظر سے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ دوسری زندگی کے ہونے کا چاہے ثبوت موجود نہ ہو، مگر بہرحال اس کے نہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے، اور امکان دونوں ہی کا ہے۔ اب اگر دوسری زندگی نہیں ہے، جیسا کہ ہم سمجھ رہے ہیں، تو ہمیں بھی مر کر مٹی ہو جانا ہے اور آخرت کے قائل کو بھی۔ اس صورت میں دونوں برابر رہیں گے۔ لیکن اگر کہیں بات وہی حق نکلی جو یہ شخص کہہ رہا ہے تو یقیناً پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ اس طرح یہ طرزِ کلام مخاطب کی ہٹ دھرمی میں ایک شگاف ڈال دیتا ہے، اور اس شگاف میں مزید وسعت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قیامت، حشر، حساب اور جنت و دوزخ کا ایسا تفصیلی نقشہ پیش کیا جانے لگتا ہے کہ جیسے کوئی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔

۲۷ آگے کا مضمون خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد بُت نہیں ہیں بلکہ فرشتے، انبیاء، اولیاء، شہداء اور صالحین ہیں جنہیں مختلف قوموں کے مشرکین معبود بنا بیٹھے ہیں۔ بظاہر ایک شخص وَمَا يَعْبُدُونَ کے الفاظ پڑھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ اس سے مراد بت ہیں، کیونکہ عربی زبان میں عموماً مَا غیر ذوی العقول اور مَن ذوی العقول کے لئے بولا جاتا ہے، جیسے ہم اُردو

پوچھے گا "کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا یہ خود راہ راست سے بھٹک گئے تھے؟" وہ عرض کریں گے "پاک ہے آپ کی ذات، ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں۔ مگر آپ نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامانِ زندگی دیا

زبان میں "کیا ہے" غیر ذوی العقول اور "کون ہے" ذوی العقول کے لیے بولتے ہیں۔ مگر اردو کی طرح عربی میں بھی یہ الفاظ بالکل ان معنوں کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ بسا اوقات ہم اردو میں کسی انسان کے متعلق تحقیر کے طور پر کہتے ہیں "وہ کیا ہے" اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کوئی بڑی ہستی نہیں ہے۔ ایسا ہی حال عربی زبان کا بھی ہے۔ چونکہ معاملہ اللہ کے مقابلے میں اس کی مخلوق کو معبود بنانے کا ہے، اس لیے خواہ فرشتوں اور بزرگ انسانوں کی حیثیت بجائے خود بہت بلند ہو مگر اللہ کے مقابلے میں تو گویا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی لیے موقع و محل کی مناسبت سے ان کے لیے مَن کے بجائے ما کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

۲۵؎ یہ مضمون متعدد مقامات پر قرآن مجید میں آیا ہے۔ مثلاً سورۂ سبا میں ہے وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهَٰؤُلَاءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ، قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِم ۖ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۖ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ "جس روز وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہاری ہی بندگی کر رہے تھے؟ وہ کہیں گے پاک ہے آپ کی ذات، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ ان سے۔ یہ لوگ تو جنوں (یعنی شیاطین) کی بندگی کر رہے تھے۔ ان میں سے اکثر انہی کے مومن تھے" (رکوع ۵) اسی طرح سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں ہے وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ..... مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ "اور جب اللہ پوچھے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو؟ وہ عرض کرے گا پاک ہے آپ کی ذات، میرے لیے یہ کب زیبا تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا ..... میں نے تو ان سے

حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے۲۶۔" یوں جھٹلا دیں گے (تمہارے معبود) تمہاری
اُن باتوں کو جو آج تم کہہ رہے ہو۲۷، پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے نہ کہیں سے مدد پا سکو گے
اور جو بھی تم میں سے ظلم۲۸ کرنے والا ہو گا اسے ہم سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔
اے محمدؐ، تم سے پہلے جو رسول ہم نے بھیجے تھے وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور
بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے۲۹۔ دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے

بس وہی کچھ کہا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔"

۲۶ یعنی یہ کم ظرف اور کمینے لوگ تھے۔ آپ نے رزق دیا تھا کہ شکر کریں۔ یہ کھا پی کر نمک حرام ہو گئے اور وہ سب نصیحتیں بھلا بیٹھے جو آپ کے بھیجے ہوئے انبیاء نے ان کو کی تھیں۔

۲۷ یعنی تمہارا یہ مذہب، جس کو تم حق سمجھے بیٹھے ہو، بالکل بے اصل ثابت ہو گا، اور تمہارے وہ معبود جن پر تمہیں بھروسہ ہے کہ یہ خدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں، الٹے تم کو خطاکار ٹھیرا کر بری الذمہ ہو جائیں گے۔ تم نے جو کچھ بھی اپنے معبودوں کو قرار دے رکھا ہے، بطور خود ہی قرار دے رکھا ہے۔ اُن میں سے کسی نے بھی تم سے یہ نہ کہا تھا کہ ہمیں یہ کچھ مانو، اور اس طرح ہماری نذر و نیاز کیا کرو، اور ہم خدا کے ہاں تمہاری سفارش کرنے کا ذمہ لیتے ہیں۔ ایسا کوئی قول کسی فرشتے یا کسی بزرگ کی طرف سے نہ یہاں تمہارے پاس موجود ہے، نہ قیامت میں تم اسے ثابت کر سکو گے، بلکہ وہ سب کے سب خود تمہاری آنکھوں کے سامنے ان باتوں کی تردید کریں گے اور تم اپنے کانوں سے ان کی تردید سن لو گے۔

۲۸ یہاں ظلم سے مراد حقیقت اور صداقت پر ظلم ہے، یعنی کفر و شرک۔ سیاق و سباق خود ہی ظاہر کر رہا ہے کہ نبی کو نہ ماننے والے اور خدا کے بجائے دوسروں کو معبود بنا بیٹھنے والے اور آخرت کا انکار کرنے والے "ظلم" کے مرتکب قرار دیے جا رہے ہیں۔

۲۹ یہ جواب ہے کفار مکہ کی اُس بات کا جو وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے کہ کفار مکہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ

آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے[۳۳]۔ کیا تم صبر کرتے ہو[۳۴]؟ تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے[۳۵] ع ۲

حضرت موسیٰ اور بہت سے دوسرے انبیاء سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کی رسالت بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے ہی میں یہ نرالا اعتراض کیوں اٹھا رہے ہو؟ پہلے کونسا نبی ایسا آیا ہے جو کھانا نہ کھاتا ہو اور بازاروں میں نہ چلتا پھرتا ہو؟ اور تو اور، خود عیسیٰ بن مریم علیہ السلام، جن کو عیسائیوں نے خدا کا بیٹا بنا رکھا ہے (اور جن کا مجسمہ کفار مکہ نے بھی کعبہ میں رکھ چھوڑا تھا) انجیلوں کے اپنے بیان کے مطابق کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔

۳۳ یعنی رسول اور اہل ایمان کے لیے منکرین آزمائش ہیں اور منکرین کے لیے رسول اور اہل ایمان۔ منکرین نے ظلم و ستم اور جاہلانہ عداوت کی جو بھٹی گرم کر رکھی ہے وہی تو وہ ذریعہ ہے جس سے ثابت ہوگا کہ رسول اور اس کے صادق الایمان پیرو کھرا سونا ہیں۔ کھوٹ جس میں بھی ہوگی وہ اس بھٹی سے بخیریت نہ گزر سکے گا، اور اس طرح خالص اہل ایمان کا ایک چیدہ گروہ چھٹ کر نکل آئے گا جس کے مقابلے میں پھر دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکے گی۔ یہ بھٹی گرم نہ ہو تو ہر طرح کے کھوٹے اور کھرے آدمی نبی کے گرد جمع ہو جائیں گے اور دین کی ابتدا ہی ایک خام جماعت سے ہوگی۔ دوسری طرف منکرین کے لیے بھی رسول اور اصحاب رسول ایک سخت آزمائش ہیں۔ ایک عام انسان کا اپنی ہی برادری کے درمیان سے یکایک نبی بنا کر اٹھا دیا جانا، اس کے پاس کوئی فوج فرا اور مال و دولت نہ ہونا، اس کے ساتھ کلام الٰہی اور پاکیزہ سیرت کے سوا کوئی عجوبہ چیز نہ ہونا، اس کے ابتدائی پیرووں میں زیادہ تر غریبوں، غلاموں اور نو عمر لوگوں کا شامل ہونا اور اللہ تعالیٰ کا ان چند مٹھی بھر انسانوں کو گویا بھیڑیوں کے درمیان بے سہارا چھوڑ دینا، یہی وہ چھلنی ہے جو غلط قسم کے آدمیوں کو دین کی طرف آنے سے روکتی ہے اور صرف ایسے ہی لوگوں کو چھان چھان کر آگے گزارتی ہے جو حق کو پہچاننے والے اور راستی کو ماننے والے ہوں۔ یہ چھلنی اگر نہ لگائی جاتی اور رسول بڑی شان و شوکت کے ساتھ آ کر تخت فرمانروائی پر جلوہ گر ہوتا، خزانوں کے منہ اس کے ماننے والوں کے لیے کھول دیے جاتے، اور سب سے پہلے بڑے بڑے رئیس آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے، تو آخر کونسا دنیا پرست اور بندۂ غرض انسان اتنا احمق ہو سکتا تھا کہ اس پر ایمان لانے والوں میں شامل نہ ہو جاتا۔ اس صورت میں تو راستی پسند

جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں؟[۳۳] یا پھر ہم اپنے رب کو دیکھیں[۳۴]"۔ بڑا گھمنڈ لے بیٹھے یہ اپنے نفس میں[۳۵] اور حد سے گزر گئے یہ اپنی سرکشی میں۔ جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ مجرموں کے لیے

لوگ سب سے پیچھے رہ جاتے اور دنیا کے طالب بازی لے جاتے۔

۳۱ یعنی اس مصلحت کو سمجھ لینے کے بعد کیا اب تم کو صبر آگیا کہ آزمائش کی یہ حالت اُس مقصدِ خیر کے لیے نہایت ضروری ہے جس کے لیے تم کام کر رہے ہو؟ کیا اب تم وہ چوٹیں کھانے پر راضی ہو جو اس آزمائش کے دور میں لگنی ناگزیر ہیں؟

۳۲ اس کے دو معنی ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارا رب جو کچھ کر رہا ہے کچھ دیکھ کر ہی کر رہا ہے، اس کی نگری اندھیر نگری نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جس خلوص اور راست بازی کے ساتھ اس کٹھن خدمت کو تم انجام دے رہے ہو وہ بھی تمہارے رب کی نگاہ میں ہے، اور تمہاری مساعیِ خیر کا مقابلہ جن زیادتیوں اور بے ایمانیوں سے کیا جا رہا ہے وہ بھی اُس سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ لہٰذا پورا اطمینان رکھو کہ نہ تم اپنی خدمات کی قدر سے محروم رہو گے اور نہ وہ اپنی زیادتیوں کے وبال سے بچے رہ جائیں گے۔

۳۳ یعنی اگر واقعی خدا کا ارادہ یہ ہے کہ ہم تک اپنا پیغام پہنچائے تو ایک نبی کو واسطہ بنا کر صرف اس کے پاس فرشتہ بھیج دینا کافی نہیں ہے، ہر شخص کے پاس ایک فرشتہ آنا چاہیے جو اُسے بتائے کہ تیرا رب تجھے یہ ہدایت دیتا ہے۔ یا فرشتوں کا ایک وفد مجمع عام میں ہم سب کے سامنے آجائے اور خدا کا پیغام پہنچا دے۔ سورۃ انعام میں بھی ان کے اس اعتراض کو نقل کیا گیا ہے: وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ اللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ "جب کوئی آیت ان کے سامنے پیش ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ ہمیں وہی کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے۔ حالانکہ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنا پیغام پہنچانے کا کیا انتظام کرے" (رکوع ۱۵)

۳۴ یعنی اللہ میاں خود تشریف لے آئیں اور فرما دیں کہ بندو، میری تم سے یہ التماس ہے۔

۳۵ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: "بڑی چیز سمجھ لیا اپنی دانست میں انھوں نے اپنے آپ کو"۔

کسی بشارت کا دن نہ ہوگا، چیخ اٹھیں گے کہ پناہ بخدا[۳۶]، اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اُسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے[۳۷]۔ بس وہی لوگ جو جنت کے مستحق ہیں اُس دن اچھی جگہ ٹھیریں گے اور دوپہر گزارنے کو عمدہ مقام پائیں گے[۳۸]۔ آسمان کو چیرتا ہوا ایک بادل اُس روز نمودار ہوگا اور فرشتوں کے پرے کے پرے اتار دئے جائیں گے۔ اُس روز حقیقی بادشاہی صرف رحمان کی ہوگی[۳۹]۔ اور وہ

۳۶؎ یہی مضمون سورۂ انعام اور سورۂ حجر میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول ص ۵۲۵ - جلد دوم صفحہ ۴۹۸ : ۵۱۰ - سورۂ بنی اسرائیل میں بھی کفار کے بہت سے عجیب و غریب مطالبات کے ساتھ اس کا ذکر کر کے جواب دیا گیا ہے۔ تفہیم القرآن جلد دوم ص ۶۴۲ تا ۶۴۴ -

۳۷؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۴۷۹ - ۴۸۰ -

۳۸؎ یعنی میدان حشر میں جنت کے مستحق لوگوں کے ساتھ مجرمین سے مختلف معاملہ ہوگا۔ وہ عزت کے ساتھ بٹھائے جائیں گے اور روزِ حشر کی سخت دوپہر گزارنے کے لیے اُن کو آرام کی جگہ دی جائے گی۔ اُس دن کی ساری سختیاں مجرموں کے لیے ہوں گی نہ کہ نیکوکاروں کے لیے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، حضور نے فرمایا والذی نفسی بیدہ انہ لیخفف علی المومن حتی یکون اخف علیہ من صلوۃ مکتوبۃ یصلیھا فی الدنیا "قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، قیامت کا عظیم الشان اور خوفناک دن ایک مومن کے لیے بہت ہلکا کر دیا جائے گا، حتیٰ کہ اتنا ہلکا جتنا دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت ہوتا ہے" (مسند احمد بروایت ابی سعید خدری)

۳۹؎ یعنی وہ ساری مجازی بادشاہیاں اور ریاستیں ختم ہو جائیں گی جو دنیا میں انسان کو دھوکے میں ڈالتی ہیں۔ وہاں صرف ایک بادشاہی باقی رہ جائے گی اور وہ وہی اللہ کی بادشاہی ہے جو اس کائنات کا حقیقی فرمانروا ہے۔ سورۂ مومن میں ارشاد ہوا ہے یَوۡمَ هُمۡ بٰرِزُوۡنَ لَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡهُمۡ شَىۡءٌ، لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ، لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ "وہ دن جب کہ یہ سب لوگ بے نقاب ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ پوچھا جائے گا آج بادشاہی کس کی ہے؟ ہر طرف سے جواب آئے گا اکیلے اللہ کی جو سب پر غالب ہے" (رکوع ۲) حدیث میں اس مضمون کو اور زیادہ کھول دیا گیا ہے۔ حضور نے

منکرین کے لیے بڑا سخت دن ہوگا۔ ظالم انسان اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا "کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی، کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کے بہکائے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی، شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا[۳۲]" اور رسول کہے گا کہ "اے میرے رب، میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنا لیا تھا[۳۳]"

فرمایا اللہ تعالیٰ ایک ہاتھ میں آسمانوں اور دوسرے ہاتھ میں زمین کو لے کر فرمائے گا انا الملک، انا الدیان، این ملوک الارض؟ این الجبارون؟ این المتکبرون؟" میں ہوں بادشاہ، میں ہوں فرمانروا، اب کہاں ہیں وہ زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں وہ جبار؟ کہاں ہیں وہ متکبر لوگ؟" (یہ روایت مسند احمد، بخاری، مسلم، اور ابوداؤد میں تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ بیان ہوئی ہے)

۳۲ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کافر ہی کے قول کا ایک حصہ ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ اس کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہو۔ اس دوسری صورت میں مناسب ترجمہ یہ ہوگا "اور شیطان تو ہے ہی انسان کو عین وقت پر دغا دینے والا"

۳۳ اصل میں لفظ مھجور استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ اگر اسے ھَجر سے مشتق مانا جائے تو معنی ہوں گے متروک، یعنی ان لوگوں نے قرآن کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھا، نہ اسے قبول کیا اور نہ اس کوئی اثر لیا۔ اور اگر ھُجر سے مشتق سمجھا جائے تو اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے اسے ہذیان اور بکواس سمجھا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اسے اپنے ہذیان اور اپنی بکواس کا ہدف بنا لیا اور اس پر طرح طرح کی باتیں چھانٹتے رہے۔

چند اعتراضات اور اُن کے جوابات

(ابوالاعلیٰ مودودی)

ایک صاحب نے ایک طویل مکتوب کی شکل میں مدیرِ "ترجمان" کی بعض تحریروں پر اعتراضات وارد کیے تھے۔ مدیرِ "ترجمان" نے ان کا مفصل جواب دیا ہے۔ افادۂ عام کی خاطر سوالات و جوابات کو ترجمان میں شائع کیا جا رہا ہے۔

راقم عرصہ کافی عرصہ سے آپ کی مصنفات کا بیک جہتی سے مطالعہ کر رہا ہے چند شبہات ایسے واقع ہوئے کہ باوجود کافی حسن ظن کے دل میں بے حد خلجان پیدا کر رہے ہیں۔ عمائدین جماعت سے بالمشافہ کئی مرتبہ گفتگو ہوئی لیکن بجائے ازالہ اضافہ ہوتا رہا۔ انہیں مخلصین کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ براہ راست جناب سے استفادہ کیا جائے لہٰذا جناب کو تکلیف دی جاتی ہے کہ مسائل مندرجہ ذیل کا تشفی بخش جواب تحریر فرما کر مشکور فرما دیں۔ اگر مناسب خیال فرمادیں تو ترجمان میں شائع فرما دیں تاکہ فائدہ عام ہو جائے۔

(۱) تفہیم القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۷۴۔ اس مقام پر جان لینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ فتح مکہ کے بعد دورِ اسلامی کا پہلا حج ۸ھ میں قدیم طریقہ پر ہوا پھر ۹ھ میں دوسرا حج مسلمانوں نے اپنے طریقہ پر کیا مشرکین نے اپنے طریقہ پر اس کے بعد تیسرا حج ۱۰ھ میں خالص اسلامی طریقہ پر ہوا۔ ۸ھ میں کون سے صحابہ حج کو تشریف لے گئے؟ حج کی فرضیت کس سنہ میں ہوئی؟ حج کی فرضیت کے ساتھ احکام نہ تھے؟ حضرت نے عازمین حج کو کوئی ہدایات

نہ دئے؟ ۹ھ میں صدیق کی زیر قیادت اسلامی طریقہ کو چھوڑ کر اپنے طریقہ پر کیسے حج کی؟ پھر حضرت نے صحابہ کو غیر اسلامی طریق پر حج کرنے پر کوئی تنبیہ نہ فرمائی؟ قدیم طریقے میں ننگے طواف ہوتا تھا کیا صحابہ نے بھی ایسا کیا؟ ہر ایک جزو کا تفصیلی جواب تحریر فرمادیں۔

۲۔ تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یونس، جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ "حضرت یونسؑ سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں۔ کیا انبیاء معصوم نہیں ہوتے؟ خصوصاً فریضۂ رسالت میں انبیاء سے کوتاہی کیسے ممکن ہے؟ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ فریضۂ رسالت کی عدم کوتاہی میں تصریح نہیں؟ اگر نبی سے فریضۂ رسالت میں بھی کوتاہی ممکن ہوسکتی ہے تو پھر دین خداوندی کا کیا رہ جاتا ہے؟ کیا یہ مضمون موہم ہتک انبیاء نہیں؟

۳۔ ترجمان اکتوبر نومبر ۵۵ء میں جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ احکام منسوخہ پر اب بھی عمل جائز ہے اگر معاشرہ کو انہی ضروریات سے سابقہ ہوجائے۔ اگر احکام شارعؑ نے منسوخ فرمائے ہیں تو پھر ان احکام کو شروع کرنے والا کونسا شارع ہوگا؟ اگر ہر ذی علم کو اس ترمیم و تنسیخ کا حق دیا جائے جب کہ اصحاب کل ذی رائی برأیہ کا دور دورہ ہے تو کیا یہ تلعب بالدین نہ ہوگا؟ آیا احکام منسوخہ میں تعمیم ہے یا تخصیص؟ محرمات اب پھر حلال ہوسکتے ہیں یا حلال شدہ احکام اب پھر منسوخ ہوسکتے ہیں؟ مہربانی فرما کر وسعت سے بحث فرمادیں کیونکہ یہ بنیادی امور سے متعلق ہے۔

ترجمان ربیع الاول ۵۸ء "حضرت آدم جس جنت میں تھے وہ زمین پر تھی" اگر جنت زمین پر تھی تو اھبطوا کیوں فرمایا؟ اخرجوا زیادہ مناسب نہ تھا؟ ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین۔ جب پہلے ہی زمین مستقر تھی تو پھر دوبارہ استقرار کیا معنی؟ نیز جنت کا قرآنی تصور تو یہ ہے عرضها السموات

والارض پھر اس کا تحقق فی الارض کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اذ یغشی السدرۃ ما یغشی عندھا جنۃ الماوی۔ کیا سدرۃ المنتہیٰ بھی زمین تھا؟ بالفرض اگر زمین پر جنت تھی تو اب کہاں ہے؟ کیوں نہ کسی طیارے سے ہم اڑ کر وہاں پہنچ جائیں؟ اگر اڑا دی گئی ہے تو کیوں اور کیا ثبوت؟

۵۔ تفہیمات ج ۲ ص ۴۳ "یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں ہو جانے دیں"۔ کیا انبیاء تمام معاصی سے معصوم نہیں؟ اگر نبی سے نبوت کے ہوتے ہوئے عصمت اٹھ سکتی ہے تو اس کی نبوت و تعلیمات نبوت پر کیسے کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ ہر اہم مقام پر شبہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ وہی مقام ہو جہاں نبی سے عصمت اٹھ چکی ہو۔ اس کی کیسے حد بندی ہو گی؟ بالتفصیل بحث فرماویں جزاکم اللہ احسن الجزاء

۶۔ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۲۱ "پس جو چیز قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی کی تصریح سے بھی اجتناب کیا جائے اور موت کی تصریح سے بھی"۔ کیا یہ مسئلہ قرآنی لحاظ سے مجمل ہے؟ ما قتلوہ وما صلبوہ میں اگر قتل جسم کی تصریح ہے تو اسی ایک جملہ کے ایک جزو وقفہ میں کونسا اجمال آگیا؟ بصورت دیگر انتشار ضمائر لازم نہ آئے گا جو معیوب ہے؟ یہاں رفع جسم سے کونسا قرینہ مانع ہے جب کہ احادیث رفع جسمانی ہی روایت کر رہی ہیں تو یہاں کیوں رفع جسم مراد نہ ہو؟ پھر اجماع امت بھی اس پر منعقد ہو چکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ متفق علیہ مسئلہ کو قرآن کے روح کے لحاظ سے مجمل کہہ کر مشتبہ بنایا جائے؟ پھر الفاظ بھی ایسے مؤکد کہ قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت۔

۷۔ تفہیمات حصہ دوم ص ۲۸۹۔ اقامت حدود میں وقت کے حالات اور ملزم کے حالات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ زمانہ جنگ میں حد موقوف رکھی جاتی ہے۔ قحط کے زمانہ میں

چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کو کتاب وسنت کی روشنی میں مدلل بیان فرمادیں۔ حضرت سعد کا واقعہ حدود اللہ کو توڑنے چھوڑنے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ انھوں نے کتاب وسنت سے کوئی مستحکم دلیل بیان نہیں کی۔[1] اسی طرح حضرت عمرؓ کا حضرت حاطب کے غلاموں کو چھوڑ دینا اور حاطب سے عوض دلوانا بھی نوعیت جرم کی بدلی ہوئی کیفیت پر دلالت کرتا ہے ورنہ مجرموں کو چھوڑ کر غیر مجرم انسان سے عوض دلوانا کیا معنی۔ یقیناً حضرت عمرؓ کے ذہن میں جرم کی نوعیت کچھ سرقہ کی سی نہ ہوگی بلکہ غصب کی سی ہوگی جس کی عنوان ان کے مولیٰ سے لی گئی۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ میں کتاب وسنت کے مستحکم دلائل بیان فرما کر مشکور کریں۔

۸۔ حضرت حوا کی پیدائش کے متعلق تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۱۹ میں جناب نے تصریح کی ہے کہ آدم کی پسلی سے نہیں ہوئی۔ حدیث بخاری خلقت من ضلع آدم کا کیا جواب ہوگا۔

۹۔ تفہیم القرآن جلد اول ص ۸۳۔ کوہ طور کے اٹھائے جانے میں جناب نے محققین مفسرین سے کیوں اختلاف فرمایا ہے؟ اس قول میں کیا قباحت ہے؟ اذ نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلۃ۔ لفظ نتق کس طرف اشارہ کر رہا ہے؟ پھر ظلۃ کیسے آپ کی تفسیر پر صادق آتا ہے۔ نیز جب کہ تلمود اور بائیبل کی روایات بھی اسی قول کی تصدیق کر رہی ہیں۔ اسی طرح لفظ رفعنا اور پھر فوقکم کا صریح مفہوم بھی آپ کی تفسیر کا انکار کر رہا ہے۔ نیز اگر حقیقت رفع مقصود نہ تھی اور صرف تخیل رفع مقصود تھا تو اس کی تصریح سے کونسا امر مانع تھا جب کہ قرآن مجید کی عادۃ مستمرہ ایسی ہے کہ ایسے مقام پر صاف تصریح کر دیتا ہے۔ واقعہ یقللھم فی اَعْیُنِکُمْ وَیُقَلِّلُکُمْ فی اعینھم۔ جب حقیقت قلت وکثرت مقصود نہ تھی، تو واشگاف الفاظ میں بیان فرمادیا۔ اسی طرح

---

[1] عجیب بات ہے کہ جو لوگ صحابہ پر تنقید کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں وہ خود بے تکلف ان پر تنقید کرتے ہیں۔ کتاب وسنت کی دلیل کے بغیر حدود اللہ کے توڑنے چھوڑنے کا یہ الزام جو حضرت سعد پر لگایا گیا ہے، تنقید کی حد سے گزر کر طعن کی حد تک پہنچ جاتا ہے، مگر علمائے کرام کے لیے سب کچھ جائز ہے۔ (ترجمان)

ویخیل الیه من سحرهم انها تسعی)۔ جب اجماع امت بھی اس پر منعقد ہو چکا ہے تو کیا وجہ ہے ایک متفق علیہ مسئلہ کو محمل کہہ کر مشتبہ بنایا جاوے۔ پھر الفاظ بھی ایسے ہوں کہ کہ قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت۔

۱۰۔ رسائل و مسائل جلد اول ص۶۷۔ مہدی پر بحث فرماتے ہوئے جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ جو مسئلہ بھی دین میں ایسی نوعیت رکھتا ہو اس کا ثبوت لازماً قرآن ہی سے ملنا چاہیے مجرد حدیث پر ایسی کسی چیز کی بنا نہیں رکھی جا سکتی جسے مدار کفر و ایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز ثابت ہو سکتی ہے تو گمان صحت نہ علم یقین۔ یہ قاعدہ کلیہ جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کیا اس سے خطرہ میں نہیں پڑ جاتے؟ کیا تعداد رکعات و سجود و صلوات کی ہیئت کذائیہ جو قرآن میں مصرح نہیں ان کے انکار سے کفر لازم نہ آئے گا؟

۱۱۔ آیت رجم کے متعلق جناب نے جو بحث ترجمان میں فرمائی ہے آپ نے اس کے ثبوت میں تامل فرمایا ہے۔ حالانکہ بخاری شریف نوکر اور سیدہ کے زنا کے معاملہ میں لڑکے کے والد کا حضور کو عرض کرنا انشدک باللہ الا قضیت بیننا بکتاب اللہ اور حضورؐ کا فرمانا والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ ان دونوں قسموں کے بعد کونسا اشتباہ رہ جاتا ہے؟ کیا حضورؐ کی قسم ہمارے یقین کے لیے ناکافی ہے؟ یا بخاری کی احادیث کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر فاروق اعظمؓ سے خطبہ فکان مما انزل اللہ آیۃ الرجم فقرءناها وعقلناها ووعیناها سے بھی یہ توقع ہو سکتی ہے کہ یوم الجمعہ مسجد میں فقہاء صحابہ کی موجودگی میں کتاب اللہ و رسول اللہ پر افترا کر سکتے ہیں؟ بصورت دیگر نعوذ باللہ جو صحابہ موجود تھے وہ سب حرارت ایمانی سے خالی ہو چکے تھے۔ ایک نے بھی نہ ٹوکا۔ جو ایک قمیص کے ٹکڑے پر عمرؓ کو اسی منبر پر ٹوک سکتے ہیں کتاب اللہ پر افترا میں نہ ٹوک سکے۔ یا قرآن سے ایک قمیص کا ٹکڑا زیادہ قیمتی تھا؟

آپ کا یہ فرمانا کہ عمرؓ کے اس قول پر اجماع منعقد نہیں ہوا اس لیے کہ سب صحابہ کی موجودگی یقینی نہیں، کیا صحابہ صلوٰۃ جمعہ سے بھی غیر حاضری کرتے تھے؟ حضرت عبدالرحمٰن کا فرمانا فانها دار الهجرة والسنة فتخلص باهل الفقه واشراف الناس صاف تصریح نہیں؟ ان دنوں فقہاء صحابہ مدینہ طیبہ میں موجود تھے۔ بالفرض اگر تمام موجود نہ تھے کیا موجود حضرات نے غیر موجود حضرات سے اس مسئلہ کی تصدیق، یا تکذیب کسی نے نہ کرائی؟ اگر واقعی صحابہ کا کتاب اللہ کے ساتھ یہی تساہل و تغافل رہا ہے اور کتاب اللہ میں کمی بیشی ہوتی رہی تو روافض بالکل حق بجانب ہیں۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کو کتاب و سنت سے مدلل بیان فرما دیں۔ حضور کی قسم اور عمرؓ کا تشدیدی خطبہ، حدیث بخاری کے مقابل کوئی قوی دلیل چاہیے کسی مفسر و مجتہد کا قول مشکل سے مقابل ہو سکے گا۔

۱۲۔ ترجمان القرآن ربیع الثانی ۷۵ھ میں جناب نے حضرت صدیقؓ کی بندش کفالت مسطحؓ کو غیر اسلامی حمیت سے تعبیر فرمایا ہے۔ کیا صدیقؓ کا نبوت سے صرف بیٹی ہی کا تعلق تھا؟ بالفرض اگر حضرتؐ کے کسی دوسرے حرم پر یہ بہتان ہوتا تو کیا حضرت صدیقؓ کو غیرت نہ آتی؟ کیا وہاں الحب للہ والبغض فی اللہ کا جذبہ کارفرما نہ تھا؟ لا یأتل اولوا الفضل سے استدلال صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہاں صرف کفالت کا کھونا نہایت نرم لہجہ میں مقصود تھا، چنانچہ لفظ اولوا الفضل والسعة کا اور پھر الا تحبون ان یغفر اللہ لکم سے ان کے پاکیزہ جذبات سے معافی کی اپیل ہے، اس میں عتاب کی بو بھی نہیں اس کو وعید تصور کرنا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کفالت کی طرف تعرض کیا گیا ہے بندش کفالت کے اصل محرکات کو نہیں چھیڑا گیا، جس کو آپ نے غیر اسلامی حمیت سے تعبیر فرمایا ہے۔ اگر یہ محرکات غیر اسلامی ہوتے تو ان یؤتوا اولی القربیٰ کے بجائے انہی محرکات کا اپریشن ہوتا۔ واللہ لا یستحیی من الحق۔ منبع فساد کو چھوڑ کر شاخوں کا انسداد قرآن کی

حکیمانہ شان سے بعید ہے۔ کفالت تو ان الفاظ سے کھل گئی، لیکن یہ منبع فساد غیر اسلامی حمیت تو ان کے دل میں ویسے ہی مستحکم رہی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق اسی ترجمان ربیع الاول ۷۵ھ میں جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ غالباً یہی شخصی عظمت کا تخیل تھا جس نے اضطراری طور پر حضرت عمرؓ کو تھوڑی دیر کے لیے مغلوب کر دیا۔ کیا نبی کی شخصیت اور اس کی عظمت کا تخیل اسلام میں ممنوع ہے۔ واللہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ الحدیث کا کیا معنی۔ باقی رہا قانون ربانی کے مقابلہ میں نبوت پرستی یا شخصیت پرستی تو محبوب رب عالم کی زندگی میں تو عمرؓ شخصیت پرست نہ تھے، بعد از انتقال یہ شخصیت پرستی کہاں سے ان کے دل میں گھس گئی؟ اساری بدر۔ صلح حدیبیہ۔ مسئلہ حجاب۔ رئیس المنافقین کا جنازہ وغیرہ لاتعداد واقعات موجود ہیں۔ صحابہ کرام اور خلفاء راشدین مہدیین کے متعلق ہمیں کس حد تک سوء ظن جائز ہے؟[1] کیا ان حضرات کے افعال کی ان توجیہات کے علاوہ اور توجیہ ناممکن تھی؟ اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم اور اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم کا کیا مقصد ہوگا؟

۱۳۔ کیا آپ معصوم عن الخطاء ہیں؟ اگر نہیں تو کیا آپ کے اجتہادات پر تنقید جائز ہے؟ اگر آپ تنقید سے بالاتر نہیں تو تنقید کرنے والے علماء پر کیوں طعن کیا جاتا ہے؟ اگر اسلام کی تعلیمات کی تعبیر کا حق صرف جماعت کے علماء کے لیے مخصوص کر دیا جائے تو اسلامی علوم کو ترقی کے بجائے رکاوٹ نہ ہوگی؟ آمرانہ رجحانات ترقی پذیر نہ ہوں گے؟ کیا موجودہ اختلاف جب کہ دیانتداری پر مبنی ہو اختلاف امتی رحمۃ نہ ہوگا؟ انہی اختلافات میں مختلف ذہنی صلاحیتوں کے جواہر منظر عام پر نہ آجائیں گے جن سے امت کو فائدہ پہنچتا رہا ہے اور رہے گا؟

۱۴۔ کیا صحابہ کرام پر تنقید جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو حدیث اللہ اللہ فی اصحابی اور

[1] صرف اس حد تک کہ "وہ کتاب وسنت کی دلیل کے بغیر حدود اللہ کو توڑنے چھوڑتے تھے"۔ ترجمان

اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اھتدیتم کا کیا جواب ہوگا؟

جواب: آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے یہ بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری تحریروں کے متعلق جو شکوک اور شبہات بعض لوگ جان بوجھ کر دلوں میں ڈال رہے ہیں ان کو صاف کرنے کے لیے میری طرف رجوع کرنا تو بلاشبہ ایک درست طریقہ ہے، مگر تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے خود بھی تحقیق کی کوشش کر لیا کریں تاکہ جس الجھن کو وہ تھوڑا سا وقت صرف کرکے خود رفع کرسکتے ہوں اس کے لیے خواہ مخواہ خط و کتابت کی زحمت میں نہ پڑیں۔ اصحابِ فتنہ کے لیے تو اب کوئی کرنے کا کام اس کے سوا باقی نہیں رہا ہے کہ وہ میری تحریروں میں کیڑے چنتے پھریں اور جگہ جگہ انہیں پھیلا کر لوگوں کے دماغوں میں الجھنیں پیدا کیا کریں۔ مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر بس ان الجھنوں ہی کو صاف کرنے میں لگا رہوں جو ان حضرات نے پیدا کی ہیں۔ آپ براہِ کرم خود غور کریں کہ ان حضرات کی انگیخت سے ۱۴ سوالات تو تنہا آپ نے فرمائے ہیں، اور ایسے سوالات کرنے والے اکیلے آپ نہیں ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے ہر گوشے سے اس طرح کے سوالات آئے دن میرے پاس آتے رہتے ہیں، کیونکہ سارے برعظیم میں فتنہ پردازوں کا ایک پورا طائفہ ان سوالات کی فصل بونے میں لگا ہوا ہے۔ اب کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ حضرات اپنی عمر عزیز اس فضول کام میں ضائع کر رہے ہیں، اسی طرح میں بھی ان کے پیدا کردہ سوالات کی جواب دہی میں اپنی عمر عزیز ضائع کردوں؟

اب آپ کے سوالات کا جواب سلسلہ وار حاضر ہے:

(۱) اس عبارت کا منشا سمجھنے میں آپ کو کسی قسم کی دقت نہ پیش آتی اگر معترضین نے آپ کے دل کو شک و شبہ کی بیماری نہ لگادی ہوتی، اور آپ خود بھی کچھ عقل سے کام لیتے۔ عبارت یہ ہے کہ "فتح مکہ کے بعد پہلا حج ۸ھ میں قدیم طریقے پر ہوا"۔ اس میں یہ کہاں لکھا ہے کہ صحابۂ کرام نے یہ حج قدیم طریقے پر کیا؟ پھر وہ سوالات جو اس عبارت پر آپ نے کیے ہیں آخر کہاں سے پیدا ہوگئے؟ آپ سیرتِ پاک کے موضوع پر کوئی کتاب بھی اٹھا کر دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوجاتا کہ مکہ معظمہ رمضان ۸ھ میں

فتح ہوا۔ دوسرے ہی مہینے حُنین اور طائف کے معرکے پیش آئے جن سے ذی القعدہ ۸ھ کے وسط میں حضور فارغ ہوئے اور عُمرہ کر کے حج کیے بغیر اپنے اصحاب کے ساتھ مدینے واپس تشریف لے گئے۔ اُس وقت یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حج کے قدیم طریقے کو، جو صدیوں سے زمانۂ جاہلیت میں رواج پا چکا تھا، اور جس کے مطابق حج کرنے کے لیے ہزاروں لاکھوں مشرکین مکہ میں جمع ہو چکے تھے یا عنقریب جمع ہونے والے تھے، یک لخت بدل ڈالا جاتا۔ اگر اُس وقت ایسا کیا جاتا تو حُنین کے معرکہ سے کئی گنا زیادہ شدید معرکہ مسجد الحرام کے حدود میں پیش آجاتا۔ اس لیے اُس سال جاہلیت کے طریقوں سے کوئی تعرض نہ کیا گیا اور حج جس طرح پہلے ہوتا تھا اُسی طرح ہونے دیا گیا۵ھ

دوسرے سال ۹ھ میں آپ نے حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو حج کے موقع پر بھیجا اور اعلان کرا دیا کہ لا یحجن بعد عامنا ھذا مشرک ولا یطوفن بالبیت عریان "اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرنے پائے اور نہ کوئی شخص برہنہ طواف کرے"۔ یہ اعلان قرآن مجید کے اس حکم کی بنیاد پر تھا کہ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (التوبہ رکوع ۴) "مشرکین تو نجس ہیں، لہٰذا اِس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں"۔ تیسرے سال ۱۰ھ میں اس حکم کی تعمیل کی گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تشریف لے جا کر حج کے خالص اسلامی طریقے کو ہمیشہ کے لیے قائم فرما دیا۔

آپ کا یہ سوال کہ حج کس سال فرض ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کے نزدیک وہ ۹ھ کے آخر، یا ۱۰ھ کے آغاز میں فرض ہوا ہے، اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صحیحین میں بنی عبد القیس کے وفد کی حاضری کا جو قصہ آیا ہے اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکان اسلام بیان کرتے ہوئے صرف چار ارکان کا ذکر فرمایا ہے، حج کا ذکر نہیں فرمایا۔ یہ وفد بالاتفاق ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے بعد حاضر ہوا تھا (زاد المعاد۔ جلد اول صفحہ ۲۶۶۔ جلد دوم صفحہ ۳۴ - ۳۹)۔ لیکن چونکہ اس سال

۵ھ یہ صرف تاریخی واقعات سے میرا استنباط ہی نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم ترین سیرت نگار ابن ہشام نے اس کی تصریح بھی کی ہے۔ وہ ۸ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: "وحج الناس تلک السنة علی ما کانت العرب تحج علیہ۔ اس سال لوگوں نے اسی طریقے پر حج کیا جس پر اہل عرب کیا کرتے تھے" (جلد ۴ صفحہ ۱۴۴)

جاہلیت کے رواجِ نسی کی وجہ سے حج ذی القعدہ میں پڑتا تھا، اور مشرکین کے ساتھ حج کرنا بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہ تھا، اس لیے آپ خود حج کے لیے تشریف نہ لے گئے اور حضرت ابوبکر و علی کو بھیجا تاکہ جاہلیت کے طریقوں کی تنسیخ کا اعلان فرما دیں۔ حج کے اسلامی احکام کی تشریح و توضیح اور عملی تعلیم ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر ہی ہوئی ہے۔

(۲) اس اعتراض کا جواب خود دینے کے بجائے میں قرآن ہی سے دلوانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ قرآن مجید میں چار مقامات پر حضرت یونس کا قصہ آیا ہے۔ براہ کرم ان سب کو پڑھ لیجیے۔

سورۂ یونس میں ہے:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَا اِيْمَانُهَا اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّا اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (آیت ۹۸)	پس کیوں نہ ہوئی کوئی ایسی بستی جو (عذاب دیکھ کر) ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نافع ہوا ہو؟ سوائے یونس کی قوم کے کہ جب وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے رسوائی کا عذاب ہٹا دیا اور ان کو ایک وقتِ خاص تک سامانِ زندگانی دیا۔

سورۂ انبیاء میں ہے:

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (آیت ۸۷)	اور یاد کرو مچھلی والے (یونسؑ) کو جب کہ وہ خفا ہو کر چل دیا اور سمجھا کہ (اس چلے جانے پر) ہم گرفت نہ کریں گے[۱]۔ پس وہ پکار اٹھا تاریکیوں میں کہ تیرے سوا کوئی خدا نہیں، تو بے عیب ہے، بے شک میں قصوروار ہوں۔

سورۂ صافات میں ہے:

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ	اور بے شک یونس رسولوں میں سے تھا جس وقت بھاگ گیا وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف تو قرعہ ڈالنے میں (اہلِ کشتی کے ساتھ) شریک ہوا اور وہی ملزم ٹھیرا۔ پھر نگل لیا اس کو مچھلی نے اور وہ

[۱] شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے "پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے"۔ مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ ہے "اور انھوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان پر (اس چلے جانے میں) کوئی دارو گیر نہ کریں گے۔"

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ	ملامت میں پڑا ہوا تھا۔ اگر نہ ہوتا وہ تسبیح کرنے والوں میں سے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہ جاتا۔

(آیت ۱۳۹ - ۱۴۴)

سورۂ قلم میں ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ (آیت ۴۸ - ۴۹)	پس اے محمدؐ صبر کے ساتھ اپنے رب کے حکم کا انتظار کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ[۱] جب کہ اس نے پکارا اور وہ غم سے گھٹ رہا تھا۔ اگر اس کے رب کے احسان نے اس کی دستگیری نہ کی ہوتی تو پھینک دیا جاتا چٹیل میدان میں اور وہ رہتا ملامت زدہ[۲]

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ حضرت یونس سے کوئی نہ کوئی قصور ضرور سرزد ہوا تھا جس پر انہیں مچھلی کے پیٹ میں پہنچایا گیا، اور وہ قصور بے صبری کی نوعیت کا تھا، اور لامحالہ وہ فریضۂ رسالت کی ادائگی ہی کے سلسلے میں ہوا تھا۔ نیز ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس اپنی قوم سے ناراض ہو کر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنا مستقرِ رسالت چھوڑ گئے تھے، اسی وجہ سے ان کی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وہ خاص رعایت فرمائی جو کبھی کسی قوم کے ساتھ نہ فرمائی گئی تھی، یعنی یہ کہ عذاب دیکھ لینے کے بعد جب وہ ایمان لے آئی تو اسے معاف کر دیا گیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی یہ مستقل سنت ہے کہ عذاب آنے دیکھ کر ایمان لانا کسی کے لیے نافع نہیں ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ہی بیان ہے، اس میں کسی قسم کی کمی و بیشی میں نے اپنی طرف سے نہیں کی ہے۔ اب اس پر آپ کو یا کسی اور کو اعتراض ہو تو یہ اعتراض مجھ پر نہیں، قرآن اور اس کے بھیجنے والے خدا پر ہے اور اس کا جواب اُسی کے ذمہ ہے۔ آپ کا یہ ارشاد کہ "کیا یہ مضمون موہم ہتک انبیاء نہیں ہے" اس مفروضہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی عزت کا خیال آپ کو ان کے بھیجنے والے خدا سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر یہ بات

۱۔ مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ ہے "اور (تنگدلی میں) مچھلی (کے پیٹ میں جانے) والے (پیغمبر یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جیے۔"

۲۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ہے "اور وہ ہوتا ملامت کیا گیا۔"

نہیں ہے تو جو مضمون اللہ نے خود اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے اِس کو موجبِ ہتک یا موہمِ ہتک قرار دینے کی اور کیا توجیہ آپ کر سکتے ہیں ؟

(۳) اس مضمون کا حوالہ آپ نے غلط دیا ہے - اوّل تو اکتوبر نومبر ۵۵ء کا کوئی یکجائی نمبر شائع ہی نہیں ہوا تھا - دوسرے یہ مضمون نہ اکتوبر کے پرچے میں ہے نہ نومبر کے پرچے میں - معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص سے آپ نے یہ اعتراض سن کر اپنی فہرست میں درج فرما لیا ہے اسے خود صحیح حوالہ معلوم نہ ہوگا - دراصل یہ مضمون رسائل و مسائل حصہ دوم میں صفحہ ۱۱۵ پر درج ہے - وہاں اُس شبہ کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو نسخ کا مسئلہ سن کر ایک عام آدمی کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے - عام طور پر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ جن آیات کا حکم منسوخ ہو چکا ہے ان کی قرآن میں اب کیا ضرورت ہے، کیوں نہ ان کی تلاوت بھی منسوخ ہو گئی - اس کو رفع کرنے کے لیے میں نے قرآن میں ان احکام کے باقی رہنے کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اگر معاشرے میں کبھی ہم کو پھر اُن حالات سے سابقہ پیش آجائے جن میں وہ احکام دیئے گئے تھے تو ہم ان پر عمل کر سکتے ہیں - مثلاً کسی ملک میں مسلمان اُس طرح کے حالات سے دوچار ہوں جو مکّی زندگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو پیش آئے تھے تو مکّی دَور کی تعلیم صبر و تحمل پر عمل کیا جائے گا نہ کہ مدنی دور کی تعلیم جہاد و قتال پر، حالانکہ بیشتر مفسرین نے احکامِ قتال سے مکّی دَور کی اُن آیات کو منسوخ قرار دیا ہے - اسی طرح اس حالت میں مسلمان اُن بہت سے احکام و قوانین کی پابندی سے معاف رکھے جائیں گے جو مدنی دَور میں نازل ہوئے اور جن پر عمل درآمد اسلامی حکومت کی موجودگی کے بغیر نہیں ہو سکتا - آپ کا یہ سوال کہ منسوخ شدہ احکام کو پھر سے مشروع کونسا شارع کرے گا، تنہا میری طرف راجع نہیں ہوتا بلکہ اُن تمام علماء کی طرف راجع ہوتا ہے جو ابھی چند سال پہلے تک انگریزی دَور میں مکّی آیات سے قومی طرزِ عمل کے لیے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور مدنی دَور کے احکامِ جنگ اور حدود اللہ کے اجراء کو ملتوی قرار دیتے تھے۔

(۴) آپ کے اس اعتراض کا جواب ترجمان القرآن کے اسی پرچے میں موجود ہے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے - اگر آپ نے ربیع الاول ۵۰ھ کا ترجمان ملاحظہ فرمایا تھا جیسا کہ آپ کے سوال سے

معلوم ہوتا ہے، تو ضرور وہ جواب آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اس کے بعد یہ اعتراض دوبارہ کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ گئی؟

اس سلسلہ میں جو سوالات آپ نے کیے ہیں، اگرچہ ان سب کے جوابات ممکن ہیں، لیکن میں اس بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں اس لیے قصداً انہیں نظر انداز کرتا ہوں۔[1] آدم علیہ السلام جس جنت میں رکھے گئے تھے، اس کی جائے وقوع کا مسئلہ اسلام میں کوئی بنیادی تو درکنار فروعی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص محض قرآن کو سمجھنے کی کوشش میں اس کے متعلق کسی خیال کا اظہار کرے تو زیادہ سے زیادہ اس سے اتنا ہی تعرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کی رائے کو آپ پسند کریں تو قبول کر لیں، نہ پسند کریں تو رد کر دیں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں ہر مسئلہ پہلے ردّوکد اور بحث و مناظرہ کا موضوع بنتا ہے اور پھر یہی ردّوکد اس کو ایک اعتقادی مسئلہ بنا کر رکھ دیتی ہے جس پر دو فریق ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہو جاتے ہیں اور جب تک فریقین کے نکاح نہ ٹوٹ جائیں معاملہ ختم نہیں ہوتا۔ اس مصیبت سے نجات پانے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ پہلے ہی مرحلہ پر سوال و جواب کا سلسلہ توڑ دیا جائے۔ آپ کا اطمینان جس بات پر نہیں ہوتا اسے آپ قطعاً نہ مانیے مگر بے فائدہ بحث کی آخر کیا ضرورت ہے۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کی عصمت بلاشبہ ایک بنیادی چیز ہے اور ہم، آپ، سب سے بڑھ کر ان کے بھیجنے والے خدا نے اس امر کا اہتمام فرمایا ہے کہ ان کا اعتماد قائم ہو۔ لیکن اسی خدا نے اپنی کتاب پاک میں متعدد انبیاء کی ایسی لغزشوں کا بھی ذکر کیا ہے جن پر گرفت یا تنبیہ کی گئی اور اس کے ساتھ وہی خدا اپنی کتاب میں ہم کو یہ اطمینان بھی دلاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو کبھی کسی چھوٹی سے چھوٹی لغزش پر بھی قائم نہیں رہنے دیا گیا، بلکہ بروقت اس کی اصلاح کر دی گئی۔[2] یہ حقیقت اگر آپ کے پیش نظر ہو،

---

[1] جن حضرات کو اس بحث کی تفصیل سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم خود ہی تفسیر روح المعانی (ج ۱۔ ص ۲۱۴) اور تفسیر المنار (ج ۱۔ ص ۲۷۷) میں اس کو نکال کر دیکھ لیں۔ وہاں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس مسئلے میں مفسرین کے کتنے اقوال ہیں، اور یہ بھی کہ ہر قول کی دلیل کیا ہے۔

[2] یہی بات علمائے اصول نے بھی اپنی کتابوں میں بیان کی ہے کہ نبی سے لغزش اور رائے کی غلطی (باقی اگلے صفحہ پر)

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان لغزشوں کے ذکر سے حضرات انبیاء کے اعتقاد میں ذرہ برابر بھی خلل واقع نہیں ہوتا، البتہ اس سے خدا اور بندے کا فرق اچھی طرح کھل جاتا ہے اور اس خطرے کا امکان باقی نہیں رہتا کہ ان برگزیدہ شخصیتوں کی طرف کوئی شخص الوہیت کی صفات منسوب کرنے لگے۔

(۶) اس اعتراض کا جواب دسمبر ۵۵ء کے ترجمان القرآن میں صفحہ ۲۸۰ پر دیا جا چکا ہے۔

(۷) اس بحث کو اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ کی کتاب اعلام الموقعین میں فصل فی تغیر الفتوی واختلافہا بحسب تغیر الازمنۃ والامکنۃ والاحوال والنیات والعوائد کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں انھوں نے احادیث و آثار سے بکثرت مثالیں اس امر کے ثبوت میں جمع کی ہیں کہ واقعات و حوادث پر اسلامی احکام کو آنکھیں بند کر کے چسپاں نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے زمانے اور مقام اور اشخاص متعلقہ کے انفرادی حالات اور دوسری بہت سی چیزوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ آپ نے میری پیش کردہ جن مثالوں پر گرفت فرمائی ہے ان سب پر، اور ان کے علاوہ متعدد دوسری مثالوں پر بھی علامہ موصوف نے مفصل بحث کی ہے۔

(۸) قرآن مجید میں کسی جگہ بھی یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت حوا کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس خیال کی تائید میں جو چیز پیش کی جا سکتی ہے وہ قرآن کا یہ ارشاد ہے کہ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النساء۔ ۱) اور جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (الاعراف ۲۴) لیکن ان دونوں آیتوں میں منہا کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اسی نفس سے اس کا جوڑا بنایا، اور یہ بھی کہ اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ ان دونوں میں سے کسی معنی کو بھی ترجیح دینے کے لیے کوئی دلیل قرآن کی ان آیتوں میں نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کی بعض دوسری آیتیں تو دوسرے معنی کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ روم میں فرمایا وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (رکوع ۳) اور سورہ شوریٰ میں فرمایا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (رکوع ۲) یہی مضمون

صادر ہو سکتی ہے، البتہ اس کا لغزش اور غلطی پر قائم رہ جانا ممکن نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح کا ذمہ لیا ہے۔ ملاحظہ ہو اصول السرخسی جلد اول صفحہ ۳۱۸، ... دوم صفحہ ۵ - ۸۶ - ۹۱

سورۂ نحل رکوع ۱۰ میں بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں آیتوں میں من انفسکم کے معنی من جنسکم ہی لیے جائیں گے، نہ یہ کہ تمام انسانوں کی بیویاں ان کی پسلیوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلے معنی کو ترجیح دینے کے لیے کوئی بنیاد مل سکتی ہے تو وہ حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایات ہیں جو بخاری و مسلم نے نقل کی ہیں۔ مگر ان کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں کہ:

المرأة کالضلع ان اقمتھا کسرتھا وان استمتعت بھا استمتعت بھا وفیھا عوج

عورت پسلی کے مانند ہے، اگر تو اسے سیدھا کرے گا تو توڑ دے گا اور اگر اس سے فائدہ اٹھائے گا تو اس کے اندر کجی باقی رہتے ہوئے ہی فائدہ اٹھا سکے گا۔

اور دوسری روایت میں انھوں نے حضور کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

استوصوا بالنساء خیراً فانھن خلقن من ضلع وان اعوج شیئٍ فی الضلع اعلاہٗ فان ذھبت تقیمہٗ کسرتہٗ وان ترکتہٗ لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء خیراً

عورتوں کے معاملے میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہیں، اور پسلی کا سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی حصہ ہوتا ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے تو اس کو توڑ دے گا اور اگر چھوڑ دے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی، لہٰذا عورتوں کے معاملہ میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو

ان دونوں حدیثوں میں سے پہلی حدیث تو عورت کو پسلی سے محض تشبیہ دے رہی ہے، اس میں سرے سے یہ ذکر ہی نہیں ہے کہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ البتہ دوسری حدیث میں پسلی سے پیدائش کی تصریح ہے، لیکن یہ امر لائق غور ہے کہ اس میں حضرت حوا، یا پہلی عورت، یا ایک عورت کی نہیں بلکہ تمام عورتوں کی پیدائش پسلی ہی سے بیان کی گئی ہے[1]۔ کیا فی الواقع دنیا کی تمام عورتیں پسلیوں

---

[1] یہ الفاظ بخاری، کتاب النکاح والی روایت کے ہیں۔ دوسری روایت جو امام بخاری نے کتاب احادیث الانبیاء میں نقل کی ہے اس کے الفاظ ہیں فان المرأة خلقت من ضلع، کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اس صورت میں المرأة سے مراد ہر عورت، اور عورتوں کی پوری صنف ہوگی نہ کہ وہ ایک خاص عورت جو دنیا میں سب سے پہلے پیدا کی گئی

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہی سے پیدا ہوا کرتی ہیں ؟ اگر یہ بات نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو ماننا پڑے گا کہ یہاں خُلِقتَ مِن ضِلَعٍ کے الفاظ اس معنی میں نہیں ہیں کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی یا بنائی گئی ہیں، بلکہ اس معنی میں ہیں کہ ان کی ساخت میں پسلی کی سی کجی ہے۔ اس کی مثال قرآن مجید کی یہ آیت ہے کہ خُلِقَ الْاِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔ اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ انسان جلدبازی سے پیدا کیا گیا ہے، بلکہ یہ ہیں کہ انسان کی سرشت میں جلدبازی ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پسلی سے حضرت حوا کی پیدائش کا خیال قرآن ہی میں نہیں حدیث میں بھی کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ روایت نقل ہو کر مسلمانوں میں شائع ہوئی اور بڑے بڑے لوگوں نے اسے نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنی کتابوں میں بھی ثبت کر دیا۔ مگر کیا یہ صحیح ہے کہ اللہ اور رسول کی سند کے بغیر محض بڑے لوگوں کے اقوال کی بنا پر اسے ایک اسلامی عقیدہ بنا دیا جائے اور جو کوئی اس پر ایمان نہ لائے اسے گمراہ قرار دیا جائے ؟

(۹) رفع طور کے بارے میں جو کچھ میں نے تفہیم القرآن جلد اول میں صفحہ ۸۴ پر اور جلد دوم میں صفحہ ۹۵ پر ترجمہ و تشریح میں لکھا ہے اس کو پھر غور سے پڑھیے۔ اس میں کہیں بھی پہاڑ کے اٹھائے جانے سے انکار نہیں ہے۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس اٹھائے جانے کی تفصیلی کیفیت متعین کرنا مشکل ہے۔ پہاڑ کے اٹھائے جانے کی ایک صورت یہ ہے کہ پورا پہاڑ زمین سے نکال کر اوپر اٹھا لیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پہاڑ کی جڑ اکھاڑ کر اسے ایک جانب اس طرح جھکا دیا جائے کہ وہ اپنے دامن میں کھڑے ہوئے لوگوں پر چھا جائے اور انہیں یوں محسوس ہو گویا اب وہ ان پر اوندھ جائے گا۔ سورۂ بقرہ کے الفاظ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ سے پہلا مفہوم ذہن میں متبادر ہوتا ہے۔ اور سورۂ اعراف کے الفاظ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ دوسرے مفہوم کی طرف ذہن کو لے جاتے ہیں۔ نتق کے معنی کسی چیز کو اکھاڑنے اور جھنجھوڑنے کے ہیں۔ قاموس میں ہے نَتَقَهٗ، زعزعہ و نفضہ۔

(بقیہ حاشیہ) اس سلسلے میں یہ بات حیرت انگیز ہے کہ سائل نے بخاری کے حوالہ سے خلقت من ضلع آدم کے الفاظ نقل کیے ہیں، حالانکہ بخاری میں کسی جگہ بھی یہ الفاظ نہیں آئے ہیں۔

مفردات امام راغب میں ہے "نتق الشئ جذبه ونزعه حتی لیسترخی۔ اساس البلاغہ میں ہے نتق البعیر الرحل، زعزعه ونتق اللہ الجبل رفعه مزعزعاً فوقھم۔ اسی بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ واقعہ کی ان دونوں ممکن صورتوں میں سے کسی ایک کی تعیین جزم کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان دونوں صورتوں کو یکساں ممکن تسلیم کرتا ہو اور کسی ایک کی تعیین میں توقف کرے تو وہ آخر کس جرم کا مرتکب ہے جس پر اتنی لے دے کی جائے؟ اس پر مزید قابل افسوس بات یہ ہے کہ لوگ جس چیز پر لے دے کرتے ہیں اس کو میری اصل کتاب میں نکال کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں اٹھاتے اور محض سنی سنائی روایات پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا یہ فقرہ کہ "کیا وجہ ہے ایک متفق علیہ مسئلہ کو مجمل کہہ کر مشتبہ بنایا جاوے پھر الفاظ بھی ایسے مؤکد کہ قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت" صاف غمازی کر رہا ہے کہ آپ نے تفہیم القرآن کی وہ عبارت خود نکال کر نہیں پڑھی جس پر آپ نے اس قدر شدت کے ساتھ گرفت فرمائی ہے، کیونکہ اس میں کہیں یہ نہیں لکھا گیا ہے کہ یہ مجمل مفہوم جو میں بیان کر رہا ہوں یہ قرآن کی رُوح سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اس غیر محتاط طریق گرفت کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ اپنی تفسیر رفع کے حق میں بے تکلف بائیبل کا حوالہ دے رہے ہیں، حالانکہ اس واقعہ کے متعلق بائیبل کی عبارتیں لے تفہیم القرآن جلد دوم میں صفحہ ۹۵ پر لفظ بلفظ نقل کر دی ہے اور وہ آپ کے بیان کے بالکل خلاف ہے۔ رہی تلمود، تو اگر وہ آپ کی نظر سے گزری ہو تو براہ کرم اس کی عبارت کا حوالہ مجھے ضرور بھیج دیں۔

(۱۰) آپ نے اس سوال میں بھی میری پوری بات نقل نہیں کی ہے بلکہ اس میں سے صرف ایک ٹکڑا نکال لیا ہے۔ براہ کرم میری پوری عبارت جو رسائل و مسائل حصہ اول میں صفحہ ۶۲ سے ۶۸ تک ہے بغور پڑھیے، اور اس کے بعد فقہ حنفی کے نامور امام شمس الائمہ سرخسی کی حسب ذیل عبارات ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے اصول السرخسی میں اسی موضوع کے متعلق لکھی ہیں۔ شاید کہ اس کے بعد آپ کو اطمینان ہو جائے کہ جو اصولی بات میں نے لکھی ہے وہ میری اپنی گھڑی ہوئی نہیں ہے بلکہ سلف سے مسلّم چلی آ رہی ہے۔ امام موصوف خبر واحد کے متعلق لکھتے ہیں:

"خبر واحد علم یقین کی موجب نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں راوی کی غلطی کا احتمال ہوتا ہے البتہ وہ راوی کے ساتھ حسنِ ظن کی بنا پر اور اس بنا پر کہ اس کی عدالت کا حال معلوم ہونے کی وجہ سے اس کے صدق کا پہلو راجح ہوجاتا ہے، ایک ایسی دلیل ضرور قرار پاتی ہے جس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے۔ بس اس قسم کی خبر کا حکم اس کی دلیل کی طاقت کے لحاظ سے ثابت ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کے انکار کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس کی دلیل موجب علم یقین نہیں ہے، اور اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے کیونکہ اس کی دلیل موجب عمل ہے، اور اس کا منکر اگر تاویل کی بنا پر انکار نہیں کرتا بلکہ بجائے خود خبر واحد ہی کو ماننے سے انکار کردیتا ہے تو اسے گمراہ قرار دیا جائے گا، لیکن اگر وہ خبر واحد کے مطابق عمل کرنے کو واجب مانتے ہوئے تاویل کی بنا پر کسی خبر کو رد کرے تو اسے گمراہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (جلد اول صفحہ ۱۱۲)

پھر وہ خبر متواتر کے متعلق فرماتے ہیں:

"اس کی تعریف یہ ہے کہ اسے اتنے کثیر التعداد لوگوں نے نقل کیا ہو کہ اتنے بہت سے آدمیوں اور مختلف علاقوں کے رہنے والے آدمیوں کے کسی جھوٹی بات پر متفق ہوجانے کا تصور نہ کیا جاسکتا ہو، اور ان کی یہ کثرت ہمارے زمانے سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصوٗر ہر دور میں پائی جاتی ہو۔ نمازوں کی تعداد، اور نماز کی رکعات کی تعداد، اور زکوٰۃ اور خون بہا کی مقداریں، اور ایسی ہی دوسری خبریں اس کی مثال ہیں۔۔۔ پس جب مختلف علاقوں کے رہنے والے راویوں کی کثرتِ تعداد کو دیکھتے ہوئے تہمتِ اختراع کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی ہو تو اس طرح کی خبر گویا ایسی ہے جیسے ہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سن رہے ہیں، اور یہ چیز جمہور فقہاء کے نزدیک موجبِ علم یقین ہے"

(جلد اول صفحہ ۲۸۲-۲۸۳)

اس کے بعد وہ اس خبر کو لیتے ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے تو اخبار آحاد کی قسم میں داخل ہو لیکن بہت سی روایتوں میں ایک مشترک معنی پائے جانے کی وجہ سے وہ مشترک معنی تواتر کے درجے میں آگیا ہو۔ اصطلاح میں ایسی خبر کو خبرِ مشہور کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں علماء کے اختلافات کا ذکر

کرنے کے بعد امام سرخسی جس قول کو ترجیح دیتے ہیں وہ یہ ہے :

عیسیٰ بن ابان رحمۃ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اس قسم کی خبریں تین اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کا انکار کرنے والے کو گمراہ کہا جا سکتا ہے مگر کافر نہیں کہا جا سکتا، مثلاً وہ خبر جس کی رو سے زانی محصن کی سزا رجم ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے منکر کو گمراہ نہیں کہا جا سکتا البتہ خطا کار کہا جا سکتا ہے اور یہ اندیشہ ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ وہ گناہ گار ہو، مثلاً مسح علی الخفین کی خبر، اور ایک ہی جنس کے دست بدست لین دین میں تفاضل کے حرام ہونے کی خبر۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس کے منکر کے گناہ گار ہونے کا خطرہ تو نہیں ہے مگر اس کی رائے کو غلط ٹھیرایا جا سکتا ہے، اور اس قسم میں باب احکام کی وہ بہت سی خبریں داخل ہیں جن کے قبول اور رد کرنے میں فقہاء کے درمیان اختلافات ہیں" (جلد اول، صفحہ ۲۹۳)

اس بحث کو آپ غور سے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مدار کفر و ایمان اگر ہو سکتے ہیں تو صرف وہ امور ہو سکتے ہیں جو کسی یقینی ذریعۂ علم سے ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچے ہوں، اور وہ ذریعہ یا تو قرآن ہے یا پھر نقلِ متواتر جس کی شرائط امام سرخسی نے واضح طور پر بیان کر دی ہیں۔ باقی جو چیزیں اخبار آحاد یا روایات مشہورہ سے نقل ہوئی ہوں وہ اپنی اپنی دلیل کی قوت کے مطابق اہمیت رکھتی ہیں، مگر ان میں سے کسی کی بھی یہ اہمیت نہیں ہے کہ اسے ایمانیات میں داخل کر دیا جائے اور اس کے نہ ماننے والے کو کافر ٹھیرایا جائے۔ مہدی کے متعلق جو روایات احادیث میں آئی ہیں ان کو اگر محدثانہ طریق پر جانچا جائے تو ان کا وہ مرتبہ بھی نہیں ٹھیرتا جو مسح علی الخفین اور ربوا الفضل کی روایات کا ہے۔

(۱۱) آپ کا یہ اعتراض میرے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ترجمان القرآن ماہ نومبر ۵۵ء میں میری وہ بحث پوری طرح پڑھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی جس پر آپ اعتراض فرما رہے ہیں۔ بخاری کی جس حدیث کا آپ ذکر کر رہے ہیں اس کی تاویل

میں نے پوری وضاحت کے ساتھ اپنے فقرہ نمبر ۶ میں کی ہے جو مذکورۂ بالا رسالے میں صفحہ ۵۸
۵۹ پر درج ہے۔ اسے پڑھ کر دیکھیے، پھر بتائیے کہ اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے
جو آپ نے کیا ہے؟ رہا فاروق اعظم کی تقریر کا معاملہ تو اس پر میں نے خود اپنی طرف سے
ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ ہدایہ کے مشہور شارح علامہ ابن ہمام کی جو عبارت مشہور مفسر قرآن
علامہ آلوسی نے روح المعانی میں نقل کی تھی اس کا صرف ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن آپ کے نزدیک قصوروار
پھر بھی میں ہی رہا، ان دونوں بزرگوں کو خطاب کر کے آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ کے
مزید اطمینان کے لیے عرض کرتا ہوں کہ اسی خطبے میں حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ والرجم فی
کتاب اللہ حق علی من زنی اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینة
او کان الحبل او الاعتراف "کتاب اللہ میں رجم حق ہے اس مرد و عورت پر جو احصان کے بعد
زنا کرے جب کہ اس پر یا تو شہادت قائم ہو جائے، یا حمل پایا جائے یا وہ خود اعتراف کرے"۔ اس
خطبے کا یہ ٹکڑا کہ حمل بجائے خود سزائے رجم کے لیے کافی ثبوت ہے، جمہور فقہاء نے تسلیم نہیں کیا
ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> "جمہور اس طرف گئے ہیں کہ مجرد حمل سے حد ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے یا تو شہادت زنا
> ہونی ضروری ہے یا پھر اعتراف۔ اور اس رائے کے حق میں وہ ان احادیث سے استدلال
> کرتے ہیں جو شبہات میں حد جاری کرنے سے منع کرتی ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا
> قول ہے اور اس کی دلیل پر اتنا بڑا حکم ثابت نہیں ہو سکتا جو ہلاکِ نفوس تک نوبت پہنچاتا ہو۔
> رہی یہ بات کہ حضرت عمرؓ نے یہ مسئلہ صحابۂ کرام کے مجمع میں بیان کیا تھا اور اس پر کسی نے
> انکار نہ کیا، تو یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ سامعین کے انکار نہ کرنے سے اجماع لازم
> نہیں آتا۔" (ج ۷، صفحہ ۸۸)

(۱۰) آپ کا یہ اعتراض در اصل اعتراض نہیں بلکہ صریح بہتان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی
آپ نے میری اصل تحریر پڑھے بغیر محض سنی سنائی تہمتوں پر یقین کر کے اپنے اعتراض نامے میں درج

کردی۔ حضرت صدیقؓ کی بندشِ کفالتِ مسطح کا قصہ ربیع الثانی ۷۵ھ کے ترجمان میں، جس کا آپ حوالہ دے رہے ہیں، سرے سے درج ہی نہیں ہے۔ اس کا ذکر جمادی الاولیٰ ۷۵ھ کے ترجمان میں آیا ہے اور اس کے اندر میں نے کہیں اشارۃً، کنایۃً بھی یہ بات نہیں لکھی ہے کہ حضرت صدیقؓ کا یہ فعل غیر اسلامی حمیت پر مبنی تھا۔ آپ مذکورۂ بالا رسالے میں صفحہ ۲۰۷ کی پوری عبارت پڑھ کر بتائیں کہ یہ بات کہاں لکھی گئی ہے؟ پھر اس میں یہ کہاں لکھا گیا ہے کہ اس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عتاب ہوا اور وعید فرمائی گئی؟

اسی اعتراض کے سلسلے میں آپ ربیع الاول ۷۵ھ کے ترجمان کا حوالہ دے کر ایک اور عبارت کا ذکر فرماتے ہیں جو حضرت عمرؓ سے متعلق ہے، مگر ربیع الاول کا ترجمان اس قسم کے ہر لفظ سے خالی ہے۔ براہِ کرم آپ پھر پڑھ کر بتائیے کہ یہ عبارت میری کس تحریر میں آپ کو ملی ہے۔ آپ تو صحابۂ کرام کی محبت کا ذکر فرماتے ہیں، مگر میرا خیال یہ ہے کہ سب سے پہلے آدمی کے دل میں خدا کا خوف ہونا چاہیے۔

(۱۳) میں نے کبھی نہ اپنے آپ کو معصوم عن الخطا سمجھا نہ کہا۔ میں نہ صرف اپنے اوپر اور اپنی ہر بات پر تنقید کو جائز سمجھتا ہوں بلکہ خود اس کی دعوت دیتا ہوں اور اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ آپ میری ہی نہیں جماعتِ اسلامی کے کسی شخص کی بھی کسی عبارت کا ایک لفظ اس الزام کے ثبوت میں پیش نہیں کر سکتے کہ ہم اسلام کی تعبیر کا حق صرف اپنے لیے مخصوص کرتے ہیں، یا اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو میں صاف کہوں کہ آپ نے اس نمبر میں جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر تعصب کی بنا پر لکھا ہے۔ جو حضرات میرے اوپر طرح طرح کے بہتان لگاتے ہیں، میری عبارتوں کو توڑ مروڑ کر ان کو غلط معنی پہناتے ہیں، اور بدترین قسم کے جھوٹے الزامات لگا کر نہ صرف تضلیل و تکفیر کے فتوے جڑتے ہیں بلکہ جگہ جگہ تقریروں اور اشتہاروں کے ذریعہ سے میرے خلاف عوام کو بھڑکاتے بھی پھرتے ہیں، وہ تو آپ کے نزدیک صرف "تنقید" کرنے والے ہیں اور ان کا یہ فعل کسی درجے میں بھی آپ کو قابلِ اعتراض یا قابلِ شکایت نظر نہیں آتا۔ البتہ ہزاروں زیادتیوں

صبر کرنے کے بعد اگر کبھی جماعت اسلامی کے کسی شخص کی زبان و قلم سے کوئی ایک لفظ ان کی تردید میں نکل جاتا ہے تو وہ آپ کو طعن نظر آتا ہے اور اس کی آپ شکایت فرماتے ہیں۔

(۱۴) تنقید کا لفظ جس معنی میں آپ نے اپنے اعتراض نمبر ۱۳ میں استعمال فرمایا ہے اُس معنی میں تو صحابہ کرام کیا، کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے انسان پر بھی تنقید کرنا میرے نزدیک سخت گناہ ہے۔ البتہ تنقید کے جو معنی اہل علم میں معلوم و معروف ہیں ان میں اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کے سوا کسی انسان کو بھی میں تنقید سے بالاتر نہیں مانتا۔ کسی صحابی کا قول یا فعل بھی محض اپنے قائل و فاعل کی شخصیت کی بنا پر حجت نہیں ہے بلکہ اس کی دلیل دیکھ کر رائے قائم کی جائے گی کہ آیا اسے قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ دلیل کے لحاظ سے کسی بات کو جانچنے کا نام ہی تنقید ہے اور یہ تنقید مجھے نہیں معلوم کہ کس زمانے میں ناجائز رہی ہے۔ فقہ کے بکثرت مسائل میں مختلف صحابہ کے مختلف قولی اور عملی آثار پائے جاتے ہیں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ تابعین اور تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین نے دلیل کی بنا پر ان میں سے کسی کو قبول اور کسی کو رد کیا ہے۔ آپ فقہ کی مبسوط کتابوں میں سے جس کو چاہیں اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو اس تنقید کی ہزاروں مثالیں مل جائیں گی۔ کیا وہ سب لوگ آپ کے نزدیک گناہ گار تھے جنھوں نے صحابہ کے مختلف اقوال و افعال میں اس طرح تنقیدی محاکمہ کیا؟ اصحابی کالنجوم والی حدیث کا اگر آپ نے یہ مطلب لیا ہے کہ ہر صحابی کا ہر قول و فعل واجب الاتباع ہے تو سلف و خلف میں کوئی صاحب علم بھی مجھ کو اس کا قائل نہیں ملا۔ آپ کو ملا ہو تو اس کا نام مجھے بھی بتائیں۔ البتہ ساری امت اپنے دین کے ہر مسئلے میں بہرحال کسی نہ کسی صحابی کے ذریعہ ہی سے رہنمائی حاصل کرتی رہی ہے اور یہی اس حدیث کا منشا ہے۔

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

(مخالفتوں کے طوفان سے گذرتے ہوئے)

مدنی دور

نعیم صدیقی

— بسلسلہ گذشتہ —

یہ نو مسلم عالم چونکہ یہود کی کمزوریوں کے رازداں، ان کی حاسدانہ نفسیات اور ان کے ذلیل کردار کے رمز شناس تھے، اس لیے خوب سمجھتے تھے کہ میرے ذہنی انقلاب پر کیا تاثر دیا جائے گا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب مفاد پرستی کی بنا پر گروہ بندیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو کردار اتنا گر جاتا ہے کہ اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنے کے بجائے اپنے بُروں کو اچھا اور دوسروں کے اچھوں کو بُرا قرار دیا جاتا ہے اپنے باڑے کی بھیڑ کالی ہو تو بھی سفید شمار ہوتی ہے اور باہر کی بھیڑ سفید ہو تو بھی اسے کالی کہا جاتا ہے بلکہ اپنے باڑے کی سفید بھیڑ باڑھ پھاند کر باہر ہوتے ہی کالی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر دور میں اس قماش کے مذہب داروں کا حال یہی رہا ہے کہ جب تک کوئی شخصیت ان کے ساتھ رہتی ہے یا کم سے کم اس سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ اس کی سرگرمیاں اپنے کاروبار پر اثر انداز ہونے والی ہیں تو اس کی خوبیوں کا خوب کھلے دل سے اعتراف کیا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھار تو پورے مبالغہ سے اس کی علمی و کرداری عظمت بیان کی جاتی ہے، لیکن وقت کی چند گردشوں کے ساتھ جب ایسی عظیم شخصیت کا بارٹ کسی بزرگ کی مذہبی مارکیٹ کے لیے ضرر رساں بن جاتا ہے، تو معاً رائے گرامی کروٹ لیتی ہے اور زبان و قلم پلٹی کھا جاتے ہیں۔ کوئی عالم تھا تو اب جاہل قرار پا جائے گا۔ مومن تھا تو اب فاسق و کافر گردانا جائے گا، خادمِ دین و ملت تھا تو اب وہ ضال و مضل گنا جائے گا، ادب و احترام کا مستحق تھا

تو اب گالیوں کا ہدف بن جائے گا۔ عبداللہ بن سلام کے سامنے یہود کی مسخ شدہ فطرت کی یہی پستیاں تھیں اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ ان پستیوں پر سے تصنع کے پردے اٹھوا دیے جائیں۔ دل ہی دل میں ایک ڈرامے کا نقشہ بنا کر انھوں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا۔ مناسب موقع پر محسنِ انسانیت کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یہود ایک باطل زدہ گروہ ہیں اور ان کے فسادِ احوال کو بے نقاب کرنے کے لیے آپ مجھے اپنے گھر میں پس پردہ بٹھا دیں اور ان کی نگاہوں سے مخفی رکھ کر ان کی رائے میرے بارے میں دریافت فرمائیں اور پھر ملاحظہ فرمائیں کہ میرے اسلام لانے سے ناواقف ہوتے ہوئے مجھے کیا مقام دیتے ہیں، کیونکہ اگر ان کو میرے قبولِ اسلام کا علم ہو گیا تو پھر وہ مجھ پر بہتان باندھیں گے اور عیب جوئی کریں گے۔ حضورؐ نے ایسا ہی کیا کہ عبداللہ بن سلام کو گھر میں آڑ کے پیچھے بٹھا دیا اور اِدھر یہودی بزرگ آ پہنچے۔ باتیں ہوئیں، سوالات پوچھتے رہے اور جواب دیے جاتے رہے۔ آخر میں رسولِ خدا نے پوچھا: "حصین بن سلام تم میں سے کیسے آدمی ہیں؟" کہنے لگے کہ وہ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے ایک سردار کے فرزند ہیں، ہمارے ایک مردِ جلیل ہیں۔ ایک بلند پایہ عالم ہیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکے تو عبداللہ بن سلام اوٹ سے باہر آ گئے اور ان کو مخاطب کر کے کہا: "اے گروہِ یہود! خدا کا خوف کرو اور جو دین حضورؐ کے ذریعے آیا ہے اسے اپنا لو، کیونکہ خدا کی قسم تم خوب سمجھتے ہو کہ آپؐ اللہ کے فرستادہ ہیں، تم حضورؐ کے اسمِ گرامی اور آپ کی صفات کا تذکرہ اپنے ہاں تورات میں لکھا دیکھتے ہو، سو میں تو گواہی دیتا ہوں کہ حضورؐ خدا کے فرستادہ ہیں اور آپؐ پر ایمان لاتا ہوں۔ اور آپؐ کی تصدیق کرتا ہوں اور آپ کو پہچانتا ہوں۔" یہود پردہ اٹھا دینے والے اس ڈرامے کو دیکھ کر بڑے سٹپٹائے اور کہنے لگے "تم جھوٹے ہو" اور پھر عبداللہ بن سلام کے درپے ہو گئے۔ ابھی چند ثانیے پہلے جس شخص کو سید اور عالم اور مردِ جلیل قرار دیا تھا، گھڑی بھر میں اسی کو جھوٹا آدمی کہہ رہے تھے۔ عبداللہ نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ میں نے حضور سے کہہ نہیں دیا تھا کہ یہ ایک باطل زدہ گروہ ہے یہ سرکشی، جھوٹ اور بداِی سے آراستہ لوگ ہیں! اس دلچسپ طریقے سے عبداللہ بن سلام نے اپنے اور اپنے گھر والوں کے اسلام کا اعلان کیا۔ تصور کیجیے کہ یہود کے دل و دماغ

کیا واردات گذرے ہوں گے۔[1]

ایسا ہی ایک واقعہ مشہور بزرگ و عالم مُخَیرِیق کا ہے جو ذرا بعد کے دور میں پیش آیا، یعنی یومِ احد پر! یہود میں سے یہ صاحب بہت مالدار بھی تھے اور کھجوروں کے باغات کے مالک تھے۔ اپنے علم کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے وہ آپ کو پہچان گئے تھے، یہاں تک کہ یومِ احد آگیا اور اتفاق سے اسی دن یومِ سبت پڑتا تھا۔ کسی مجلس میں انھوں نے کہا کہ "اے گروہِ یہود! خدا کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمدؐ کی مدد کرنا تم پر لازم آتا ہے"۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ ــــ اہلِ شرک کے مقابلے میں مسلم جماعت کی امداد اصولاً تم پر واجب ہے، دوسرے بروئے معاہدہ تم اس بات کے پابند ہو کہ پیش آمدہ تصادم میں اس حلیف طاقت کا ساتھ دو۔ اس پر جو جواب یہود نے دیا وہ حیلہ باز اور نکتہ طراز مذہبی ذہن کی گھناؤنی تصویر کو پوری طرح سامنے لے آتا ہے۔ کہنے لگے کہ "آج کا دن تو یومِ سبت ہے"۔ اس جواب پر درشتی سے مُخَیرِیق نے کہا "کوئی سبت نہیں ہے تمھارے لیے"! پھر اس فرض شناس مجاہد نے ہتھیار سنبھالے اور شہر سے نکل کر میدانِ احد میں رسول اللہ سے جا ملے۔ جاتے ہوئے اپنے اہلِ خاندان سے یہ بات طے کرتے گئے کہ اگر میں آج مارا جاؤں تو میرے تمام اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیئے جائیں اور وہ اللہ کی رہنمائی کے تحت جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ چنانچہ یہ جانباز میدان میں کام آگیا اور اس کے ترکہ کو رسولِ خدا نے اپنے قبضہ میں لے کر صرف کیا۔ کسی قدر اختلاف اس بارے میں ہے کہ مخیریق اسلام لائے تھے یا نہیں۔

تحریکِ اسلامی کی اس فاتحانہ یلغار پر یہود کی فاسد مذہبیت کا جو باطنی ردِ عمل تھا اس کا اندازہ اسی سلسلے کے ایک دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت صفیہؓ بنت حُیَیّ بن اَخطب یہ روداد بیان کرتی ہیں کہ میں اپنے والد اور چچا کی نگاہ میں ساری اولاد سے زیادہ چہیتی تھی اور دونوں ہمہ وقت ساتھ رکھتے تھے۔ جب رسولِ خدا مدینہ آئے اور قبا میں قیام فرمایا تو میرے والد حُیَیّ بن اَخطب اور

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ ج ۲ ص ۱۶۲-۱۶۳

چچا ابویاسر بن اخطب منہ اندھیرے ملاقات کے لیے گئے۔ لوٹے تو غروبِ آفتاب کا وقت تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بہت تھکے ماندے اور پریشاں خاطر ہیں۔ وہ بہت دھیمے انداز سے چلے آرہے تھے۔ میں معمول کے مطابق مسکراتی ہوئی ان کی طرف متوجہ ہوئی لیکن بخدا پریشانی کے مارے دونوں میں سے کسی نے میری طرف التفات نہ کیا۔ میرے چچا ابویاسر والد سے کہہ رہے تھے: "کیا یہ وہی (پیغمبر موعود) ہے؟" والد نے کہا: "ہاں، خدا کی قسم!" چچا نے پھر پوچھا: "کیا تم نے اسے پہچان لیا ہے اور یقین کر لیا ہے؟" والد نے جواب دیا "ہاں"! اس پر چچا نے دریافت کیا "پھر اس کے لیے تمہارے دل میں کیا جذبہ ہے؟" والد نے کہا: "دشمنی ہی دشمنی۔ جب تک زندہ ہوں، خدا کی قسم!"

یہ تھا یہود کا اصل ذہن! یعنی خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے سامنے آنے والا داعیِ حق ہے، خدا کا پیغام لانے والا ہے! اس کا ہر بول اس کی سچائی پر گواہ ہے، اس کا پورا کردار اس کے مرتبہ کو نمایاں کر رہا ہے، اس کا چہرہ اور اس کی وجاہت اس کی نبوت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ سمجھتے ہی نہیں خلوتوں میں زبان سے اقرار تک کرتے ہیں، لیکن ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرنے کے بجائے مخالفت و عداوت کا عزم باندھتے ہیں۔ یہ فطرت یہود کے ہاں عام تھی۔ آفتاب نکلتا ہے تو کون نہیں جانتا کہ طوفانِ نور اُبل پڑا۔ آدمی اور حیوانات تو خیر آنکھیں رکھتے ہیں، گھاس کی ایک پتی کو علم ہو جاتا ہے کہ وہ ہونے والا واقعہ ہو گیا جو ہر شبِ تیرہ کے خاتمے پر روز ہوا کرتا ہے، بلکہ حرارت اور گرمی مٹی کے بے جان ذرّوں اور پانی کے قطروں اور ہوا کی موجوں تک کو یہ معرفت دے دیتی ہیں کہ نور کا پیغامبر جلوہ آرا ہو چکا۔ طلوعِ آفتاب تو ایسا بڑا انقلابی واقعہ ہوتا ہے کہ اسے چمگادڑیں اور اُلّو تک جان جاتے ہیں، ان کی فطرتِ کج کی امتیازی شان بس یہ ہوتی ہے کہ روشنی ہونے پر اور دنیا کی تو آنکھیں کھلتی ہیں اور ان کی آنکھیں بند ہو جایا کرتی ہیں، بلکہ ان کے لیے سورج کے نکل آنے کی علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان کی آنکھیں چندھیا کے رہ جائیں۔ انسان اتنا اندھا نہیں ہو سکتا کہ اس کے سامنے خدا کے انبیاء مرتبۂ اعجاز کو پہنچے ہوئے علم و کردار کے ساتھ جلوہ گر ہوں اور وہ یہ نہ محسوس کر لے کہ

کوئی عظمت مآب اور غیر معمولی اہمیت کی شخصیت ابھری ہے۔ آدمی دیکھتا ہے، سمجھتا ہے، جانتا ہے اور جاننے کے بعد آنکھیں بند کرتا ہے، پھر بھی اگر روشنی پپوٹوں کے پردوں کو چیر کر اندر جا پہنچتی ہے تو آنکھوں پر پٹیاں باندھتا ہے، ہاتھوں سے ان کو بھینچ لیتا ہے، منہ ریت میں چھپا لیتا ہے، کمروں کے دروازے کھڑکیاں بند کر کے کالے پردے ان پر ڈال دیتا ہے۔ کہتے ہیں: سوتے کو جگایا جا سکتا ہے، جاگتے کو جگانا ممکن نہیں ہوتا۔ ٹھیک اسی طرح انجان کو علم دیا جا سکتا ہے لیکن جاننے والے کو انجان بن جانے پر جہل کے عالم سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ ٹھیک یہی حال تھا جس میں یہود کی اکثریت اور خصوصاً ان کے علماء و کبار جا پڑے تھے۔ قرآن نے بھی ان کے اس فساد کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" یعنی یہ حق اور داعیِ حق کو اسی قطعیت کے ساتھ جانتے ہیں جیسے اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

یہودیت کے سربراہ کار محسنِ انسانیت کے علوِ مرتبہ کو دیکھ دیکھ کر جلتے تھے اور جوں جوں عامۃ الناس اور ان کے اپنے ریوڑ کے افراد نئی دعوت کی طرف لپک رہے تھے، ان کے دلوں کی فضا میں کھچاؤ بڑھ رہا تھا۔

مناظرانہ سوالات | بگڑے ہوئے مذہب داروں کے دلوں میں جب کسی موثر دعوت اور کسی فروغ پاتی ہوئی تحریک اور کسی جلیل القدر داعی کے خلاف کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ تو ام پکڑ لیتا ہے تو وہ افہام و تفہیم کے دروازے بند کر کے مناظرے کا دنگل کھول دیتے ہیں۔ مناظرے کی اسپرٹ سے جو سوالات و شکوک اٹھائے جاتے ہیں ان کا منشا کبھی یہ نہیں ہوتا کہ ایک بات کو سمجھنا ہے، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیدھی سادی بات کو سمجھ کے نہیں دینا ہے۔ یعنی مناظرے کی روح ہے "میں نہ مانوں"! لیکن مقصد اتنا ہی نہیں ہوتا، وسیع تر منتہا یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس کو مذہبِ حق کی فطری راہ سے ہٹا کر شکوک و شبہات کے خارزاروں میں ڈال دیا جائے اور وہ سیدھے استدلال سے دور ہو کر نظری سوالات کے چکر میں پڑ جائیں۔ وہ دعوت کی عقلی قدر و قیمت اور اس کے اخلاقی اثرات کو جانچنے کے بجائے پیچیدہ ٹکنیکل مسائل کی بھول بھلیاں میں گھومتے ہیں۔ علمائے یہود اپنے آپ بیتی تھ

سو فی صدی اطمینان رکھتے ہیں کہ ہمیں دعوتِ حق کبھی ختم نہیں کر سکتی، ڈر انھیں ہوتا ہے اپنی بھیڑوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا، ان کی حفاظت کے لیے وہ ٹیڑھے ٹیڑھے سوالات کے جھاؤ کا باڑا بناتے ہیں۔ یہود کے علمائے سوء بھی اس کے سوا اور کیا کرتے؟

عبداللہ بن سلام کے تحریکِ اسلامی میں شامل ہو جانے کے بعد یہود نے مناظرانہ بحثوں اور کاوشوں کے مورچے جمانے پر پوری پوری توجہ صرف کر دی اور کج بحثیوں کے ترکش کھول کر منطقیت کے تیر تحریکِ اسلامی پر برسانے شروع کر دیئے۔ مگر یہ ساری جنگی کارروائی بھی کھلے مورچوں سے نہیں، منافقت کی ٹٹیوں سے جاری کی گئی۔ یہ بزرگانِ تقویٰ کیش حق پژوہی کے بڑے مرعوب کن بہروپ بھر کر تحریکِ اسلامی کے اجتماعات میں شریک ہوتے۔ پھر باتوں باتوں میں گربہ مسکینی کے طرز سے ہونٹ لٹکا لٹکا کر سوالات سامنے لاتے۔

ایک اجتماع میں حضور رسالت مآب کے سامنے انھوں نے یہ سوال رکھا: "خلق کو جب خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو آخر خود خدا تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟" دیکھا آپ نے ذہن کا ٹیڑھ! ـــــ یہود خود اسی خدا پر ایمان رکھنے کے دعوے دار تھے، اس کے پیغمبروں کے معتقد اور اس کی کتاب کے علمبردار تھے۔ وہ خدا کو پہلے سے جانتے تھے، اس کی صفات سے آگاہ تھے، لیکن اسی خدا کی طرف جب اسلام نے بلایا تو خدا کے بارے میں ان کے دلوں میں بڑا بھاری اشکال پیدا ہو گیا اور ان کے سوال کا گویا ظاہری مدعا یہ تھا کہ اگر یہ اشکال رفع ہو جائے تو پھر ان کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ کھل جائے۔ لیکن سوال کا ٹیڑھ بتا رہا ہے کہ مقصود طلبِ ہدایت نہیں بلکہ لوگوں کو ہدایت سے بچنے کے لیے راہِ فرار دکھانا ہے۔ آنحضورؐ نے اس ٹیڑھے سوال کا جواب بہت ہی سیدھے طریق سے دیا، یعنی سنجیدگی سے سورۂ اخلاص پڑھ دی۔ "کہو (اے محمدؐ) کہ اللہ یکتا ہے، وہ بے ہمہ ہے، نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اور کوئی اس کا ہمتا نہیں ہو سکتا"[1]

آئیے آپ کو ایک اور دلچسپ مجلسِ گفتگو میں لے چلیں۔ یہود کے بعض نامور مولوی ایک دن

---

[1] حیاتِ محمدؐ: محمد حسین ہیکل مصری

حضورؐ کے حلقہ میں آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے چار سوالوں کا جواب دیجیے، پھر ہم آپؐ کی دعوت مان لیں گے اور آپ کی اطاعت قبول کر لیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اب اس عہد کی ذمہ داری تم پر ہے جو کچھ پوچھنا ہے۔ سوالوں کے سامنے آنے سے قبل آپ ذرا خود اندازہ کیجیے کہ تحریک اسلامی کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے معقول لوگوں کی طرف سے کس قسم کے استفسارات کی توقع کی جانی چاہیے۔ وہ پوچھتے تو اساسی صداقتوں کے بارے میں پوچھتے، اسلام کی اخلاقی قدروں کے بارے میں پوچھتے، سیاسی و معاشی نظام اور اس کے طریق کار کے بارے میں پوچھتے، مسلمان ہونے کے شرائط و لوازم کے بارے میں پوچھتے، اپنی زندگیوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے علمی مسائل کے متعلق پوچھتے۔ لیکن ان چیزوں سے وہاں سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ انھوں نے اپنے علم و فراست کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہ سوالات یکے بعد دیگرے پیش کیے:

۱۔ بچہ ماں کے مشابہ کیوں ہو جاتا ہے، جب کہ وہ اپنے باپ کے نطفہ سے تشکیل پاتا ہے؟

۲۔ آپؐ کی نیند کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

۳۔ اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے کیا چیزیں اپنے اوپر حرام کر لی تھیں اور کیوں؟

ان کسوٹیوں پر تحریک اسلامی کی حقانیت کو جانچا جا رہا تھا!

چوتھا سوال البتہ کچھ نہ کچھ تعلق براہ راست دعوت و تحریک سے رکھتا تھا مگر اسپرٹ اس کی بھی ویسی ہی تھی۔ پوچھا گیا کہ 'روح (فرشتہ وحی)' کیا ہے؟

حضورؐ نے سکون سے ایک ایک سوال کا جواب دیا اور آخری سوال کے جواب میں فرمایا کہ تم خود اس بارے میں جانتے ہو کہ وہ جبریلؑ ہے اور وہی میرے پاس آتا ہے۔

سب سوالات ہو چکے، جوابات سامنے آ گئے، ان جوابوں میں سے کسی کی تردید نہیں کی گئی بلکہ ہر ایک پر کہا گیا: "اللھم، نعم" یعنی "ٹھیک، اے ہمارے اللہ"!

آپ توقع کریں گے کہ ان جوابات کے بعد انھوں نے دلوں کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیے ہوں گے، ہرگز نہیں! آخری بات پر وہ کہنے لگے: "لیکن، اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، جبریلؑ تو

ہمارا دشمن ہے ، وہ ایک ایسا فرشتہ ہے کہ جب جب آتا ہے تو مصیبت اور خون خرابے کا پیغام لے کے آتا ہے"۔ مراد یہ تھی کہ وہ جب خدا کی طرف سے دین کی علمبرداری کا مطالبہ لاتا ہے تو ایک کشمکش ناگزیر ہو جاتی ہے ، طرح طرح کے نقصانات سر پڑتے ہیں اور بڑے بڑے چرکے کھانے پڑتے ہیں ، بلکہ نوبت جہاد تک پہنچتی ہے۔ اس سے ہماری نہیں بنتی "بس اس فرشتے کی دشمنی آڑے نہ آتی ہوتی تو پھر ہم آپؐ کا ضرور ساتھ دیتے اور آپؐ کے نقشِ قدم پر چلتے"۔ یعنی دعوت ٹھیک ، پیغام برحق ، تحریک درست ، مگر اس کے پس منظر میں جس فرشتے کو خدا نے لا ڈالا ہے اس سے ہماری صاحب سلامت ختم ہو چکی ہے ، لہٰذا جہاں وہ ہوگا وہاں ہم نہیں آسکتے !

اس کا جواب محسنِ انسانیت نے قرآن کے الفاظ میں ایسا دیا کہ بس سننے والوں کو ہمیشہ یاد رہا ہوگا۔ فرمایا: "کہو (اے محمدؐ) کہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو (وہ کان کھول کر سُن لے کہ) قرآن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل پر اپنے فرمان کے تحت اتارا ہے جو اپنے سے پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے (عداوت اور مصیبت اور خون خرابے کا پیغام نہیں بلکہ) ذریعۂ ہدایت و بشارت ہے[1]۔"

ایک اور بحث پیدا ہو گئی۔ سرورِ عالمؐ نے کسی موقع پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر سلسلۂ انبیاء میں فرمایا۔ اس پر یہودی حلقوں میں بڑا چرچا ہوا۔ ہر طرف کہا جانے لگا: "کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی انوکھی بات سُنی ؟ کہتے ہیں کہ سلیمان بن داؤد بھی پیغمبر تھے ! خدا کی قسم ، وہ تو محض ایک جادوگر (نعوذ باللہ) تھے۔ چنانچہ قرآن نے اس واہیات چرچے کی تردید کی کہ جادوگری تو ایک کافرانہ حرکت ہے اور حضرت سلیمانؑ نے کبھی یہ حرکت نہیں کی۔ چاہِ بابل کے جو قصے مشہور ہیں وہ تو شیطان کے کرشمے تھے[2]

(باقی)

---

۱ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۱-۹۲ .

۲ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۲

مسئلہ متعہ

مولانا محمد یوسف صاحب

(بسلسلہ گذشتہ)

ابن عباسؓ کا مسلک اب ہم امر دوم یعنی حضرت ابن عباسؓ کے رجوع کے مسئلے پر بحث کریں گے، لیکن اس بحث سے قبل یہ امر ملحوظ خاطر رہے، کہ متعہ کے بارے میں روایات مختلفہ کا منشا متعین کرنے میں صحابہؓ مختلف ہو گئے ہیں، ابن عباسؓ کا خیال یہ تھا کہ رخصت کے احکام شدید ضرورت کے لیے تھے، اور نہی کا حکم ضرورت نہ رہنے کی حالت کے لیے تھا، اس لیے ضرورت اور شدید حالت اضطرار میں رخصت کے احکام ہمیشہ کے لیے معمول رہیں گے، اور ضرورت کے ماسوائے دیگر حالات میں نہی کے حکم پر دائماً عمل درآمد کیا جائے گا، اس کے برخلاف جمہور صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ رخصت کا حکم اباحت کے لیے تھا، اور نہی کا حکم اس اباحت کو منسوخ کرنے کے لیے دیا گیا تھا لہذا نہی کے حکم سے متعہ تمام حالات میں منسوخ ہو کر ہمیشہ کے لیے حرام رہے گا۔ اسی اختلاف کی بناء پر دوسری صدی ہجری کے آغاز تک یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا۔ اور اختلاف کی نوعیت یہ تھی کہ آیا یہ قطعی حرام ہے تمام حالات میں۔ یا اس کی حرمت مردار اور خنزیر کی سی ہے، جو بحالت اضطرار جواز سے بدل سکتی ہے؟ پہلی بات کے قائل جمہور صحابہؓ و تابعینؒ تھے۔ اور دوسری بات کے قائل ابن عباسؓ اور ان کے ہمنوا علماء کرام تھے۔ امام المفسرین، والمحدثین حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے سلف کے مذاہب کو اپنے رسالہ "الانصاف فی سبب الاختلاف" میں اسی طرح نقل کیا ہے قال

ومنها اختلافهم في الجمع بين المختلفين	اختلاف کے اسباب میں سے ایک ان کا اختلاف رائے ہے دو مختلف
مثاله رخص رسول الله صلعم في المتعة	احادیث کے جمع کرنے کے بارے میں، اس کی مثال یہ ہے کہ جنگ خیبر
عام خيبر ثم نهى عنها، ثم رخص فيها	حضورؐ نے متعہ کی اجازت دی تھی پھر اس سے ممانعت فرمائی۔ پھر

عام اوطاس، ثم نهی عنها، فقال ابن عباسؓ کانت الرخصة للضرورة والنهی لانقضاء الضرورة والحکم باق علی ذالك وقال الجمهور کانت الرخصة اباحة والنهی نسخا لها اھ ص ۱۵۱	جنگ اوطاس کے زمانے میں دوبارہ اجازت عطا فرمائی پھر اس سے منع فرما دیا، (ان مختلف روایات میں جمع کرنے اور تطبیق دینے کے لیے) ابن عباسؓ یہ فرماتے ہیں کہ رخصت ضرورت کی بناء پر دی گئی تھی۔ اور جب ضرورت نہ رہی، تو نہی کا حکم دیا گیا اور یہی حکم اسی طرح بحال رہے گا " (یعنی ضرورت کی حالت میں متعہ جائز ہوگا) اور جمہورؒ کی رائے یہ ہے کہ رخصت بطور اباحت تھی جس کو ممانعت نے آکر ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا "

رجوع ابن عباسؓ کی تحقیق ہمارے لیے ابن عباسؓ کا رجوع ایک لاینحل معمہ بن گیا ہے۔ علماء امت میں سے ایک بہت بڑی جماعت نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جب تک ابن عباس کو نہی کی روایات نہیں پہنچی تھیں۔ ابن عباس حالت اضطرار میں جواز متعہ کا فتویٰ دیتے رہے۔ اور جب نہی کی روایات ان کو پہنچیں تو جواز کے فتوے سے رجوع کر کے دیگر صحابہؓ کے ساتھ حرمت قطعی فی جمیع الاحوال پر متفق ہو گئے۔ اور صحابہؓ ہی کے زمانے سے اسی طرح مسئلہ اجماعی شکل میں منقول ہوتا چلا آیا ہے لیکن،

بعض دوسرے علماء کا خیال یہ ہے کہ ابن عباس کا رجوع صحیح نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود اور ان کے دیگر ہمنوا علماء اور شاگرد اپنے فتوے اباحت پر تا زیست قائم رہے ہیں۔ اور یہ مسئلہ دوسری صدی ہجری کے آغاز تک اختلافی رہا ہے۔ اس کے بعد اہل سنت کے تمام علماء اس پر متفق ہو گئے۔ اور جواز بحالت اضطرار کا مسلک رد کر دیا گیا۔

میں نے اپنی کوتاہی نظر اور علمی بے بضاعتی کے باوجود حسب مقدور حتی الامکان اس مسئلہ کی تحقیق کی ہے اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، کہ مؤخر الذکر علماء کا قول دلائل کے لحاظ سے زیادہ صحیح ہے اور یقیناً ابن عباس کا رجوع پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچا ہے۔ بلکہ واقعات پر نظر رکھنے سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ ابن عباسؓ بڑی مضبوطی سے خلافت راشدہ کی دور کے بعد بھی اپنے قول پر آخری وقت تک قائم رہ چکے ہیں۔ یہاں تک کہ عبداللہؓ بن زبیر نے تو انھیں اپنے دور خلافت میں سنگسار

کرنے تک کی دھمکی بھی دے دی، مگر وہ رجوع کے لیے تیار نہ ہوئے۔

اصرار کی وجہ ابن عباسؓ کو اس رائے پر اصرار اس لیے نہیں تھا کہ انہیں نبی کی روایات پہنچی نہ تھیں، جیسا کہ پہلے گروہ کا خیال ہے۔ کیونکہ حضرت علیؓ، اور ابن زبیرؓ کے ذریعہ یہ روایات اُنہیں پہنچی تھیں بلکہ یہ اصرار صرف اس بنا پر تھا کہ نبی کی روایات کا ان کے نزدیک محل الگ تھا۔ اور رخصت کی روایات کے لیے الگ۔ چنانچہ سعید بن جبیر نے جب اُنھیں فتوے کے نتائج سے آگاہ کر دیا۔ تو وہ فرمانے لگے کہ "میں نے یہ فتویٰ نہیں دیا ہے، اور متعہ مضطر لوگوں کے علاوہ کسی کے لیے حلال نہیں ہے"۔

اَب جب کہ رجوع اختلافی ہوا تو ضروری ہے کہ وہ دلائل ذکر کیے جائیں جن سے مقدم الذکر علماء نے رجوع پر استدلال قائم کیا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ تنقیدات بھی ذکر کی جائیں جو موخر الذکر علماء کی طرف سے اُن پر کی گئیں ہیں، تاکہ اس بارے میں ایک ناظر کے لیے صحیح رائے قائم کرنے میں دشواری نہ رہے۔

جن علماء کی رائے میں ابن عباس کا رجوع محقق ہے۔ اُن میں قاضی عیاضؒ، علامہ خطابی علامہ عینیؒ اور محقق ابنؒ الہمام بھی شامل ہیں۔ یہ حضرات اپنے دعوے رجوع کو ثابت کرنے کے لیے حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں

رجوع کے قائلین کے دلائل اور ان پر تنقید "فی صحیح مسلم ان علیاً سمع ابن عباس یلین فی متعۃ النساء فقال مھلاً یا ابن عباسؓ! فانی سمعت رسول اللہ صلعم نھی عنھا یوم خیبرؓ" صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے ابن عباس سے سنا کہ وہ متعہ کے بارے میں نرمی کرتے تھے، تو حضرت علیؓ نے ان سے کہا۔ ابن عباس! یہ نرمی چھوڑ دو! میں نے خود آنحضرت صلعم سے سنا ہے کہ خیبر کے دن آپ نے متعہ سے ممانعت فرمائی تھی" فتح القدیر ج ۳ ص ۱۵۱

اس دلیل پر محقق ابن ہمامؒ نے خود یہ تنقید کی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ ثابت ہو سکتا ہے۔ تو وہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ابن عباس سے یہ کہا تھا کہ تم فتوے اباحت سے باز آؤ! رہا یہ کہ انھوں نے رجوع بھی کیا تھا۔ تو اول اس روایت میں رجوع کا اصلاً ذکر نہیں ہے۔ ثانیاً، عبداللہ ابن زبیر اور ابن عباس کی وہ گفتگو جو ابن زبیرؓ کے دور خلافت میں دونوں کے درمیان میں مکہ معظمہ میں ہوئی ہے

وہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ حضرت علیؓ کے منع کرنے سے ابن عباسؓ اپنے خیال سے باز نہیں آئے تھے۔ ورنہ حضرت علی کی وفات کے بہت بعد ابن عباسؓ کو ابن زبیرؓ کی جانب سے سرزنش کرنے کی نوبت پیش نہ آتی۔ تنقید کے الفاظ درج ذیل ہیں:

وهذا ليس صريحاً في رجوعه بل في قول عليؓ له ذلك ويدل على انه لم يرجع حيث قال له عليؓ ذلك ما في صحيح مسلمؒ عن عروة ابن الزبيرؓ، ان عبد الله بن الزبير قام بمكة فقال ان ناساً اعمى الله قلوبهم كما اعمى ابصارهم يفتون بالمتعة، يعرض برجل فناداه فقال انك لجلف جاف فلعمري لقد كانت المتعة تفعل في عهد امام المتقين يريد به رسول الله صلعم، فقال ابن الزبيرؓ فجرب بنفسك فوالله لئن فعلتها لارجمنك باحجارك (الحديث)، ولا تردد في ان ابن عباس هو الرجل المعرض به وانما كان ذلك في خلافة ابن الزبير وذلك بعد وفاة عليؓ، فقد ثبت انه مستمر القول على جوازها ولم يرجع الى قول عليؓ.

اھ فتح القدیر ج ۳ ص۱۵۱

یہ روایت ابن عباس کے رجوع میں صریح نہیں ہے بلکہ اس میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ابن عباس سے یہ کہا تھا کہ تم اپنے خیال سے باز آجاؤ، رہا رجوع! تو مسلم کی وہ روایت جس میں یہ آتا ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک دن ابن زبیر نے اپنے دوران قیام میں کھڑے ہو کر کہا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے موجود ہیں، جن کے دلوں سے اللہ تعالیٰ نے نورانیت سلب کی ہے۔ جیسے کہ ان کی آنکھوں سے ظاہری بینائی زائل کی ہے۔ یہ لوگ متعہ کے جواز کا فتوے دینے لگے ہیں۔ عروہ کہتے ہیں کہ اس سے غرض ابن عباس پر تعریض کرنی تھی۔ اس پر ابن عباس نے ابن زبیرؓ کو آواز دے کر کہا کہ تم بڑے سخت مزاج اور کم علم آدمی ہو، میں اپنی بقاء کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ متعہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں کیا جاتا تھا جو تمام دنیا کے متقیوں کے پیشوا اور امام ہیں، اس پر ابن زبیر نے کہا۔ اچھا تو اپنے آپ تجربہ کر کے دیکھو خدا کی قسم اگر تو نے یہ فعل کر لیا۔ تو میں تجھے سنگسار کروں گا۔ یہ روایت صاف دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ حضرت علیؓ کے کہنے سے ابن عباس اپنے خیال سے باز آئے نہیں تھے کیونکہ یہ گفتگو ابن زبیر کی خلافت کے دور میں ہوئی تھی۔ جو حضرت علیؓ کی وفات کے بہت بعد ہے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ ابن عباس اپنے قول پر قائم رہے تھے

نہ کہ حضرت علیؓ کے قول کی طرف راجع ہوئے۔"

دوسری دلیل جو یہ حضرات اپنے دعوے رجوع کے ثبوت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے

۲ - عن ابن عباس انه قال انما كانت المتعة فى اول الاسلام كان الرجل يقدم البلد ليس له بها معرفة فيتزوج المرأة بقدر ما يرى انه يقيم فتحفظ له متاعه وتصلح له شانه حتى اذا نزلت الآية الا على ازواجهم او ما ملكت ايمانهم الآية قال ابن عباس فكل فرج سواهما فهو حرام

ابن عباس فرماتے ہیں، کہ متعہ ابتداء اسلام میں ایسی حالتوں میں جائز تھا۔ جب کوئی آدمی کسی ایسے شہر یا گاؤں میں جاتا جہاں کسی سے اس کی معرفت نہ ہوتی۔ تو وہاں مدت قیام تک کسی ایسی عورت سے نکاح (متعہ) کرتا۔ جو اس کے لیے سامان کی حفاظت اور دیگر معاملات کی اصلاح کا کام کرتی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی الا علی ازواجہم تو ابن عباس نے کہا۔ بیوی، اور لونڈی کے ماسوا سب عورتیں حرام ہیں۔"

رواہ الترمذیؒ، فتح القدیر ج ۳ ص ۱۵۱

اس روایت میں ابن عباس کا رجوع صراحۃ مذکور ہے۔ مگر افسوس! کہ سند، اور مضمون دونوں کے اعتبار سے یہ روایت مجروح ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے حسب ذیل دو وجوہ سے اس روایت پر تنقید کی ہے:

اوّل یہ: ما ادرى ما عنى باول الاسلام فان عنى ما كان فى مكة قبل الهجرة افاد الخبر انها كانت تفعل قبل الهجرة الى ان نزلت الآية فان كان نزولها قبل الهجرة فلا اشكال فى الاستدلال بها على الحرمة ولم يكن بعد نزولها اباحة لكنه قد كان وان عنى ما كان بعد الهجرة او انها وانها كانت مباحة اذ ذاك الى ان نزلت الآية

معلوم نہیں ہے کہ ابن عباس نے اول اسلام سے کیا مراد لیا ہے؟ اگر ان کی مراد مکی زندگی کا دور ہو تو حدیث کا حاصل یہ ہوگا کہ ہجرت سے پہلے مکی دور میں متعہ نزول آیت کے زمانے تک مباح تھا۔ جب آیت نازل ہوئی تو حرام قرار پایا۔ اب اگر آیت بھی قبل از ہجرت نازل ہوئی ہوتی اور نزول آیت کے بعد متعہ مباح نہ ہوتا تو اس سے متعہ کی حرمت پہ استدلال بغیر کسی اشکال کے صحیح ہوتا مگر یہ حقیقت ہے کہ متعہ آیت کے نزول کے بعد بھی مباح رہا ہے۔ اور اگر اول اسلام سے ان کی مراد ہجرت کے بعد مدنی زندگی کے اوائل عہد اور

كان ذلك، قولا بنزول الآية بعد الهجرة وهو خلاف ما روي عنه من ان السورة مكية وكذا الآية)

مطلب یہ ہو کہ اوائل ہجرت میں نزول آیت کے زمانے تک متعہ مباح تھا۔ اور جب آیت نازل ہوئی، تو حرام ٹھیرا تو یہ اس کا اعتراف ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے حالانکہ ابن عباس ہی سے یہ منقول ہے کہ سورۃ اور آیت دونوں مکی ہیں نہ کہ مدنی۔"

تنقید کی دوسری وجہ جو علامہ آلوسی نے ذکر کی ہے یہ ہے :

۲- او يقال ان هذا الخبر لم يصح و يؤيد هذا قول العلامة ابن حجر: حكاية الرجوع عن ابن عباس لم تصح

یا اس روایت کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ یہ صحیح نہیں ہے، اس کی تائید حافظ ابن حجر کے اس قول سے ہوتی ہے" کہ ابن عباس سے رجوع کا نقل صحیح اور ثابت شدہ نہیں ہے"

اھ روح المعانی، ج ۵، ص۱۔

حاصل تنقید حاصل التنقید، یہ ہے کہ ابن عباس کی روایت مذکورہ بلحاظ مضمون قابل اعتماد ایک تو اس لیے نہیں ہے کہ ابھی تک اس امر کی تحقیق نہیں ہو سکی ہے کہ اس روایت میں اول اسلام سے مراد کیا ہے؟ ماقبل از ہجرت مراد لینے کی صورت میں، حرمت متعہ پر آیت سے استدلال صحیح نہیں رہتا ہے، کیونکہ متعہ نزول آیت کے بعد بھی مباح رہا ہے اور ہجرت کے اوائل مراد لینے سے آیت اور سورۃ کے مدنی ہونے کا اعتراف لازم آتا ہے۔ حالانکہ ابن عباس ہی نے تصریح کی ہے کہ سورت اور آیت دونوں مکی ہیں نہ کہ مدنی! دوسرے یہ روایت اس وجہ سے بھی قابل اعتماد نہیں ہے کہ اس میں یہ مذکور ہے کہ نزول آیت کے بعد ابن عباس اباحت سے رجوع کر کے حرمت کے قائل ہو چکے ہیں۔ حالانکہ یہ تمام ان روایات صحیحہ کے خلاف ہے جو پہلے گذر چکی ہیں جن میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے، کہ وہ آخری وقت تک فتوے اباحت پر قائم رہ چکے ہیں۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس کی تائید حافظ ابن حجر کے اس قول سے بھی ہو سکتی ہے کہ "ابن عباس سے رجوع کا قول اور نقل صحیح نہیں ہے۔"

اسی طرح یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ج ۹ ص ۱۴۲ میں اس روایت کے متعلق لکھا ہے:"

وامّا ما اخرجه الترمذیؒ من طریق محمد بن کعب عن ابن عباسؓ قال انما کانت المتعة فی اول الاسلام کان الرجل یقدم البلد (الحدیث) فاسناده ضعیف وهو شاذ مخالف لما رویناه من علة اباحتها اھ (فتح الباری)

ترمذیؒ کی وہ روایت جو اس نے محمد بن کعب کے طریقے سے ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔ کہ متعہ صرف ابتداء اسلام میں مباح تھا جب کہ کوئی شخص کسی ایسے گاؤں میں جاتا، تو اس روایت کا اسناد ضعیف ہے۔ اور یہ شاذ ہے۔ بوجہ اس کے کہ یہ روایت ان صحیح روایتوں کے خلاف ہے جو ہم نے اباحت متعہ کی علت کے بارے میں نقل کی ہیں"

الحاصل: ابن عباسؓ کے رجوع کے لیے جو مذکورہ بالا روایتیں پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی روایت اگرچہ صحیح ہے۔ مگر اس سے رجوع ثابت ہو نہیں سکتا ہے اور دوسری روایت میں اگرچہ ابن عباسؓ کا رجوع مذکور ہے مگر وہ بتصریح محدثین صحیح نہیں ہے۔

ابن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کی باہمی گفتگو سے رجوع پر استدلال بھی قابل تسلیم نہیں ہے۔ کیونکہ ابن عباسؓ کا جواب، "انک جلف جاف" اور "لقد کانت المتعة تفعل فی عهد امام المتقین" صاف بتلا رہا ہے کہ ابن عباسؓ نہ صرف یہ کہ اپنے خیال سے باز نہیں آئے بلکہ وہ اپنے مخالف کو علمی طریقہ سے سخت ڈانٹ دے رہے تھے کہ تم میں سوائے سخت مزاجی کے نہ حدیث رسول کے موقعہ و محل سمجھنے اور معلوم کرنے کا علم و بصیرت ہے۔ نہ فہم و فراست ہے۔ نہ حقیقت تقویٰ سے واقفیت! اس لیے اس سے بھی رجوع پر استدلال نہ صرف یہ کہ غیر ظاہر ہے بلکہ غیر صحیح بھی ہے۔

مذکورہ بالا دو روایتوں کے علاوہ ممکن ہے کہ اور بھی روایات ہوں جن میں ابن عباسؓ کا رجوع مذکور ہو یا ان سے رجوع پر استدلال کیا گیا ہو۔ مگر میری نظر سے نہیں گذری ہیں۔ تاہم تمام روایات رجوع کے متعلق اجمالاً ابن بطالؒ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ روایات ضعیف ہیں:

قال ابن بطالؒ وروی عنه الرجوع باسانید ضعیفة واجازة المتعة عنه اصح اھ

ابن بطالؒ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ سے ضعیف اسانید کے ساتھ رجوع بھی منقول ہے، مگر متعہ کی اجازت کا نقل ابن عباس سے زیادہ صحیح ہے۔" فتح الباری ج ۹ ص ۱۴۲

اس کے بعد علماء امت میں سے ان حضرات کی تصریحات پیش کی جاتی ہیں جن کی رائے میں ابن عباس اور اس کے ہمنوا علماء کا رجوع، جوازِ متعہ بحالت اضطرار سے ثابت نہیں ہے تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ ان کے رجوع کا مسئلہ اختلافی ہے نہ کہ متفق علیہ۔

حافظ ابن حجرؒ اور علامہ زرکشیؒ کی رائے | جن علماء کے نزدیک ابن عباسؓ اور اس کے ہم خیال علماء کا رجوع ثابت شدہ نہیں ہے، ان میں سے ایک حافظ ابن حجرؒ اور دوسرے علامہ زرکشیؒ بھی ہیں ان دونوں بزرگوں کی رائے علامہ سید آلوسیؒ نے حسب ذیل الفاظ میں پیش فرمائی ہے:

قال العلامة ابن حجر ان حكاية الرجوع عن ابن عباس لم تصح بل صح كما قال بعضهم عن جمع انهم وافقوه في الحل لكن خالفوه في الاحكام فقالوا لا يترتب عليه احكام النكاح وبهذا نازع الزركشي في حكاية الاجماع فقال الخلاف محقق وان ادعى جمع نفيه اھ

روح المعانی ج ۸ ص ۱۰

"حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ابن عباس سے رجوع کی حکایت اور نقل صحیح نہیں ہے (بلکہ صحیح یہ ہے کہ وہ اپنی رائے پر قائم رہے ہیں) اور بقول بعض علماء کے ایک ابن عباس ہی نہیں بلکہ دوسری ایک جماعت سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچی ہے کہ اس نے ابن عباس کے ساتھ حلت متعہ میں اتفاق کیا ہے۔ خلاف صرف احکام میں کیا ہے۔ ابن عباس کا خیال یہ تھا کہ اس پر احکام نکاح بھی مرتب ہوں گے۔ اور دوسروں کا مذہب یہ ہے کہ نکاح کے احکام اس پر مرتب نہ ہوں گے، علامہ زرکشیؒ نے بھی نقل اجماع کے خلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ صحابہؓ کے مابین اس مسئلہ میں ثابت شدہ امر اختلاف ہے، نہ اتفاق! گو ایک جماعت نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کے درمیان میں اختلاف نہیں تھا بلکہ سب اس پر متفق ہوگئے تھے۔"

فتح الباری میں، مقام متعہ پر اس قول کی بہت تلاش کی گئی۔ مگر کہیں نہیں ملا۔ ممکن ہے کسی دوسری کتاب سے سید آلوسیؒ نے اسے نقل کیا ہو۔

(باقی)

مطبوعات

کتابیں، رسائل اور پمفلٹ بہت بڑی تعداد میں جمع ہیں اور ان کے مقابلے میں تبصرہ کے صفحات کا دامن بہت ہی تنگ ہے۔ مجبوراً ہم اجمالی تعارف کا طریقہ اختیار کر رہے ہیں

فاران ـــــ سیرت نمبر بادارت جناب ماہر القادری۔ مقام اشاعت: کیمبل اسٹریٹ کراچی

قیمت سیرت نمبر ڈھائی روپے، چندہ سالانہ چھ روپے۔

فاران علمی و ادبی اور دینی و اخلاقی لحاظ سے پاکستان کے جرائد کی صف اول میں جگہ حاصل کر چکا ہے جنوری ۵۶ء میں اپنا لاجواب سیرت نمبر پیش کر کے فاران نے سرزمینِ ہند و پاک کے اصحابِ علم و نقد سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ عنوانات میں بڑی ندرت ہے، مقالات میں تنوع ہے، منظومات میں روحِ ایمانی کارفرما ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ سارا مواد محض معلومات افزا ہی نہیں، تحریک زا بھی ہے مختلف حلقوں کے چوٹی کے علماء و مفکرین اور شعراء و ادباء اس کی ترتیب میں حصہ دار ہیں۔ سیرت نمبر کی مقبولیت کا عالم یہ ہوا کہ اب تک اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ اس نمبر کے مطالعہ سے انسانیت کے اس اعلیٰ و برتر نمونہ و معیار کا پورا پورا تصور حاصل ہوتا ہے جس کا عکس قبول کر کے ہی انسان انسان بن سکتا ہے اور ایک صالح تمدن کی تشکیل کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ تین سو سے زائد صفحات، خوشنما سہ رنگا سرورق، کتابت و طباعت معیاری۔

فردوس مجموعہ کلام جناب ماہر القادری۔ شائع کردہ، مکتبہ چراغ راہ، کراچی۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

بزم شعر و سخن میں جناب ماہر القادری کو برسوں سے ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ لیکن اس صاحب طرز شاعر کے فکر و فن نے جب سے تحویل قبلہ کیا ہے، اس کا مرتبہ اور بھی بلند و برتر ہو گیا ہے "صبحِ بنارس" سے "صبحِ سعادت" تک بڑا فاصلہ تھا مگر طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے ایک ایسی حقیقت ہے کہ فردوس کے مطالعہ سے اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لذیت کے بت کدوں کو

توڑ پھوڑ کر شاعرِ فردوس مقصدیت کے حرم میں داخل ہوتا ہے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے: "حرم میں اذانِ سحر، اللہ اللہ"! ماہر القادری کے تازہ ترین مجموعۂ کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دین و دانش، عقل و جنون اور ایمان و فن گھلے ملے ہیں۔ اسلامیت کے پورے زور پر ہونے کے باوجود شعریت میں ذرا فرق نہیں آیا بلکہ شعری کیف و جمال میں اور زیادہ گہرائی آگئی ہے۔ فردوس اغیار کے اس فرسودہ نظریہ کی ایک زندہ تردید ہے کہ اسلام اور شعریت و جمالیت کے درمیان کوئی جوڑ نہیں۔ ماہر القادری نے حسین ترین پیرایوں میں نہ صرف یہ کہ حقیقت کے تمام اہم اعتقادی پہلوؤں کو پیش کیا ہے بلکہ وقت کا سیاسی مدوجزر بھی فردوس میں منعکس ہے، لیکن شاعر کا بنیادی اسلوبِ تغزل ایک ایسی شانِ کمال کے ساتھ جلوہ گر ہے کہ اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ افسوس کہ ہم مثالیں دے کر اور ان کا تجزیہ کر کے تفصیل سے ماہر کی شاعری کے نئے اسلامی رنگ کی خصوصیات پیش نہیں کر سکتے۔ مجملاً اتنا ہی کہیں گے کہ "فردوس" کاروانِ شعر و سخن کے سامنے نئی نئی منزلوں اور نئے نئے مرحلوں کو لا رکھنے والا مجموعۂ کلام ہے۔ طباعتی معیار اور سرورق کی رنگینی داد طلب ہے۔

الاعتصام — حجیتِ حدیث نمبر | بادارت جناب محمد اسحٰق صاحب۔ مقام اشاعت: گجرانوالہ قیمت خاص نمبر ایک روپیہ آٹھ آنے۔

الاعتصام جماعت اہلِ حدیث کا آرگن ہے۔ قدرتی طور پر اس ہفت روزہ جریدے سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کتاب و سنت کی حمایت میں فتنۂ انکارِ حدیث کے خلاف معرکہ آرا ہو۔ اس توقع کے مطابق یہ نمبر ہماری نگاہوں میں قابلِ خیر مقدم ہے۔ بہت سے اہلِ علم و فکر کے متنوع مقالات اس میں جمع کیے گئے ہیں۔ حدیث کی گراں بہا سائنس کے متعدد پہلو ان مقالات کی روشنی میں قارئین کے سامنے واضح ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس علمی مجموعہ کے دامنِ سنجیدگی پر ایک بہت ہی بدنما داغ لگ گیا ہے۔ مولانا محی الدین احمد قصوری بی اے کے قلم سے جو مقالہ "انکارِ حدیث یا انکارِ رسالت" کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے اس میں منکرینِ حدیث کے دو گروہ بیان کیے گئے ہیں۔ ایک، وہ جو نفسِ حدیث

ہی کا انکار کرتا ہے ، دوسرا وہ گروہ جو حدیث کو ظنی کہہ کر اس کی حجیت سے انکار کرتا ہے ۔ بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں گروہ آج بھی موجود ہیں اور وہ کون کون ہیں ، سنئے :

" زمانۂ حاضر میں پہلے گروہ میں پرویز اور اس کی ذریت شامل ہے جس کا شجرہ نسب عبداللہ چکڑالوی آنجہانی سے جا ملتا ہے ۔ دوسرے گروہ کی سب سے روشن و تابندہ مثال عہد حاضر کے فاضلِ اجل مولانا مودودی ہیں ۔ اس آخری گروہ کی تحریریں پڑھ جائیے اور ایک ہزار سال پیچھے چلے جائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ معتزلہ کا وہی اگلا ہوا نوالہ ہے جو یہ لوگ جگالی کرکے ہمارے سامنے پھینک رہے ہیں " ـــــ " پہلا گروہ اکثر منکرین کا ہے جن کی جہالت ، ضد اور انکار کو قرآن جابجا واشگاف کرتا ہے ۔ ان کا حکم منکرین رسالت کا ہے ۔ دوسرا گروہ علمائے موولین کا ہے جو اپنے علم کے زور اور گھمنڈ پر ہمیشہ حدیث کے مقابلہ کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں نکلا ہے ۔ یہ ایک توارد ہے کہ عہد سلف میں بھی جن لوگوں نے حدیث کی حجیت کا انکار کیا تھا وہ بھی علم و فضل میں وقت کے استاذ ہوتے تھے ، ان کی تقریریں نہایت دل نشیں اور تحریریں نہایت زبردست اور پرزور ہوتی تھیں ۔ آج بھی اس گروہ کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کا شمار وقت کے مشاہیر علما میں ہوتا ہے اور جو بڑی بڑی جماعتوں کے مقتدا اور پیشوا متصور ہوتے ہیں " ۔ ص ۷

اس اقتباس کے پس منظر میں کام کرتی ہوئی ذہنیت کا مطالعہ و تجزیہ کیجیے ۔ اندازِ بیان اور انتخابِ الفاظ کے ذریعے ان جذبات کو پہچانیے جو اس تحریر میں پل رہے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کی ذہنیت وقت کے فتنوں کا مقابلہ کامیابی سے کر بھی سکتی ہے ۔ جب اپنے پرائے کی سوجھ بوجھ نہ ہو اور جس میں چھوٹے چھوٹے اختلافِ آرا کا ظرف نہ ہو ۔ سنت اور حدیث کے بارے میں مولٰنا مودودی اور جماعت اسلامی کا کام دنیا بھر کے سامنے ہے اور دنیا کے سامنے نہ ہو تو خدا کی نگاہوں سے تو بہرحال مخفی نہیں ۔ یہی کام ہے جس کی وجہ سے منکرین سنت کے پورے محاذ نے اپنی زیادہ سے زیادہ قوتِ مخالفت ادھر صرف کردی ہے ۔ اب اگر آپ ایسے لوگوں پر بھی حملہ آور ہوتے ہیں تو منکرین حدیث کے ہاتھ

خود ہی مضبوط کرتے ہیں۔ کیا ادارۂ الاعتصام میں، گروہ اہلِ حدیث میں یا جماعت اہلِ حدیث کی مجلس عاملہ میں کوئی اکا دکا افراد بھی ایسے نہیں رہے جو اس قسم کی ذہنیت کو اپنے حلقے میں پنپنے سے روکیں اور اس طرح کی مضرِ مقصد تحریروں کی اشاعت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں۔ جماعت اسلامی یا مولانا مودودی سے آپ کو اختلاف ہو تو سو بار اس کا اظہار کیجیے، لیکن یہ کیا ضرور کہ ان پر انکارِ حجیت حدیث کی فردِ جرم ہی لگائی جائے۔ اس بے جوڑ مقالے کو درکنار رکھ کر باقی سارے مجموعے کو ہم بہت قابلِ قدر پاتے ہیں اور خواہشمند ہیں کہ اسے پڑھا جائے اور پھیلایا جائے۔

دعوتی کیلنڈر | شائع کردہ: مکتبہ تعمیر انسانیت گوجر گلی، موچی دروازہ، لاہور۔ قیمت فی عدد ۸

اس دعوتی کیلنڈر کی شان یہ ہے کہ اس کے اوپر کا نصف حصہ کئی کئی رنگوں میں چھپے ہوئے اسلامی کتبات یا طغراؤں پر مشتمل ہے۔ نیچے کے حصے میں دوہرا کیلنڈر ہے، یعنی عیسوی اور ہجری تقویمیں الگ الگ دی گئی ہیں۔ وسط میں بارہ صفحات کے اندر تحریک اسلامی کی بنیادی دعوت، اس کی تنظیم، اس کے طریقِ کار، اس کے مختلف شعبوں اور اس کے داعی کے حالات کے سلسلے میں ضروری معلومات درج کی گئی ہیں۔ مکتبہ تعمیر انسانیت نے کیلنڈروں کی دنیا میں ایک نئی راہ نکالی ہے۔

آسمانی فیصلے، بجواب قرآنی فیصلے | مصنفہ جناب میاں محمد حافظ نوشہروی، قیمت ایک روپیہ بارہ آنے شائع کردہ، ادارۂ عروجِ اسلام، خوشاب سرگودھا۔ کتابت و طباعت سادہ۔

چوہدری غلام احمد پرویز کی کتاب "قرآنی فیصلے" کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اندازِ بیان کہیں کہیں الجھا ہوا اور زبان قدیم اسلوب میں ڈھلی ہوئی ہے، اس کے باوجود کتاب بعض مفید معلومات سے خالی نہیں ہے۔

یہ مؤلف کا نقشِ اوّل ہے، اگر جنابِ مؤلف اہلِ علم اصحابِ قلم سے مشورے لیتے رہیں، تو نقشِ ثانی، سلاست و روانی کے لحاظ سے بہتر ہو سکتا ہے، اور اسلوبِ کلام مناظرانہ ہونے کے بجائے تحقیقی رنگ اختیار کر سکتا ہے۔

خالی صفحہ

مخلوط انتخاب کے انتشار انگیز نعروں

نے پاکستان کی جد و جہد میں اپنی جان ' مال اور آبرو کی قربانی دینے والے لاکھوں مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا مسلمانوں کا تہذیب و تمدن دوسری تہذیبوں سے کوئی جداگانہ نوعیت نہیں رکھتا اور کیا پاکستان کے حصول کے لئے ساری قربانیاں بیکار نہیں تھیں ۔ اگر مسلمانوں کے تصور زندگی اور غیر مسلموں کے تصور زندگی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور پاکستان میں بھی اسلام کو اجتماعی نظام کی حیثیت سے اس لئے اختیار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر مسلم اسے پسند نہیں کرتے ۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے نہایت تفصیل کے ساتھ اسلامی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے تمیز کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلامی تہذیب کے ماخذ دنیا کی دوسری تمام تہذیبوں سے قطعاً مختلف ہیں اور اسلامی تہذیب و تمدن کو اس وقت تک صحیح معنوں میں نہ قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ اختیار ہی کیا جا سکتا ہے جب تک کہ ان بنیادوں کو تسلیم نہ کیا جائے جن پر اسلامی تہذیب کی عمارت استوار کی گئی ہے ۔ دیدہ زیب گرد پوش اور مضبوط جلد قیمت تین روپے آٹھ آنے ۔

تاریخ کا کوئی دور ہو

پتھر کا زمانہ ہو یا ایٹم کا دور

اسلام

ہر دور میں ایک نہایت کامیاب اجتماعی نظام کی حیثیت سے چل سکتا ہے کیونکہ اس کے اصول انسانی فطرت کی بنیاد پر قائم ہیں اور الہامی ہدایت کی روشنی سے منور ہیں

تنقیحات

میں مولانا امین احسن اصلاحی نے مختلف علمی ' سیاسی ' معاشی اور معاشرتی مسائل کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں اتنی خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ حل کیا ہے کہ نہ صرف مختلف گتھیاں سلجھ گئی ہیں بلکہ اسلام کی انقلاب انگیز دعوت بھی پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ گئی ہے ۔ خوبصورت گرد پوش اور مضبوط جلد ۔ قیمت ساڑھے تین روپے ۔

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان ۔ اچھرہ ۔ لاہور

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور میں چھپا